آج کا انسان اور

اجتماعی مشکلات

شہید راہ حق:

حضرت آیت اللہ سید محمد باقر الصدر رحمۃ اللہ علیہ

معراج کمپنی

بیسمنٹ میاں مارکیٹ غزنی سٹریٹ اردو بازار لاہور

نام کتاب: آج کا انسان اور اجتماعی مشکلات

مولف: حضرت آیت اللہ سید محمد باقر الصدر رحمۃ اللہ علیہ

مترجم: علامہ ذیشان حیدر جوادی

کمپوزنگ: انس کمیونیکیشن 0300-4271066

ناشر: معراج کمپنی لاہور

پیشکش وتعاون: باب العلم دار التحقیق (فروغ ایمان ٹرسٹ) کراچی

زیرِ اہتمام: ابوظہیر

ملنے کا پتہ

محمد علی بک ایجنسی اسلام آباد

0333-5234311

فہرست

عرض ناشر 5
آج کا اِنسانی مسئلہ 7
انسانیت اور مسئلہ کا حل 9
مارکس ازم 10
غیر مارکسی مفکرین 13
طبیعی اور سماجی تجربات کا فرق 14
تجربات کے فرق 14
تفصیلی گفتگو 23
''سرمایہ دارنہ ڈیموکریسی'' 25
سرمایہ داری کا مادی رخ 28
سرمایہ داری اور اخلاق 31
سرمایہ داری کے مظالم 32
اشتراکیت واشتمالیت 35

اشتمالیت سے انحراف 38
اشتمالیت کا محاسبہ 40
مسئلہ کی صحیح توجیہہ 45
اسلام اور اجتماعی مشکل 45
مشکل کا صحیح حل 50
اسلام کا پیغام 54
اسلام اور حریت وضمانت 60
سرمایہ دارانہ معاشرے کی حریت 61
شخصی حریت 67
اجتماعی حریت 73
ضمانت اسلام اور مارکس ازم میں 81
توضیحات مترجم 85
سرمایہ داری اور فلسفہ 85
کفالت وضمانت 87

عَرضِ ناشر

ابتدا ہے اپنے رب تعالیٰ کے نام سے جو حقیقت میں عبادت کے لائق ہے درود بنی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات اقدس پر کہ جن پر خدا اور اس کے فرشتے بھی درود بھیجتے ہیں، اور سلام ہے ان کی اولاد پر جو ہماری رہنما اور وصی ہیں۔

معراج کمپنی کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ اس نے اپنے قیام کے دن سے آج تک منفرد کام سرانجام دیئے ہیں، جناب سید العلما، آغا رہبر اور دیگر اکابرین کے آثار وافکار پر کام کیا اور ان بزرگانِ دین کی کتب کو جمع کر کے اشاعت کے زیور سے آراستہ کیا، اور اب شہید باقر الصدر رحمۃ اللہ علیہ کے افکار وآثار کو جمع وتدوین کا بیڑا اٹھایا ہے، شہید کی دستیاب کتب شائع کرنے کا اعزاز بھی معراج کمپنی کے حصہ میں آیا ہے۔ یہ خدا کے احسان ورحمت کے سوا کچھ نہیں ہے کہ اس نے ہم جیسے سیاہ کاروں سے ان بزرگوں کے آثار کی جمع وتدوین کا کام لیا ہے۔

پیام اسلامک سنٹر کراچی کے مہتم محترم جناب سید فدا حسین رضوی نے ہماری توجہ اس طرف مبذول کرائی کہ جناب شہید باقر الصدر رحمۃ اللہ علیہ کی گراں قدر کتب میں سے اس وقت کوئی کتاب بھی پاکستان میں دستیاب نہیں ہے جس سے محبان شہید باقر الصدر رحمۃ اللہ علیہ بہت افسردہ ہیں، نا صرف توجہ دلائی بلکہ کتب بھی مہیا کیں اگر یہ کہا جائے کہ یہ ساری کاوش جناب سید فدا حسین رضوی صاحب کی ہے تو بے جا نہ ہوگا ادارہ ان کا انتہائی ممنون و

مشکور ہے اور ان کے لئے دعا گو ہے۔ اللہ ان کی توفیقات خیر میں اضافہ فرمائے۔

زیر نظر کتاب شہید باقر الصدر رحمۃ اللہ علیہ کی تصنیف ہے جس میں آپ نے انسان کو درپیش مسائل کے حل کے لئے اپنی ماہرانہ اور مفکرانہ معروضات پیش کی ہیں۔ اگر ہم اپنے مسائل کو حل کرنے کے لئے سنجیدہ ہیں تو کوئی وجہ نہیں ہے کہ اس کتاب کے مطالعہ کے بعد ہم اپنے اجتماعی اور انفرادی مسائل پر قابو نہ پا سکیں۔ مذکورہ کتاب کو اردو کے قالب میں ڈھالنے کے لئے جناب علامہ سید ذیشان حیدر جوادی نے اپنی خدمات پیش کی ہیں جو کسی بھی تعارف کے محتاج نہیں ہیں۔

اس کتاب کی اشاعت کے لئے باب العلم دار التحقیق (فروغ ایمان ٹرسٹ) کراچی کے رئیس جناب سید شہنشاہ حسین نقوی مدظلہ العالی نے مالی تعاون پیش فرمایا ہے اللہ رب العزت ان کی توفیقات خیر میں اضافہ فرمائے اور ان کو جزائے خیر عطا فرمائے۔

اگر کسی کے پاس شہید باقر الصدر کی کوئی تصنیف موجود ہے تو ازراہ کرم ہمیں ارسال فرمادیں تاکہ اس کو شائع کیا جا سکے اور آپ اس کار خیر میں ہمارے رفیق کار ہوں اور دنیا اور آخرت کی منازل میں ترقی کا سبب بن جائیں۔

آج کا اِنسانی مسئلہ

دور حاضر کا وہ اہم مسئلہ جس نے انسانی فکر کو پراگندہ کر دیا ہے اور جس کا تعلق براہ راست انسانی زندگی کی گہرائیوں سے ہے۔

ایک ایسے نظام کی تلاش کا ہے جو انسانیت کے لئے صالح اور اجتماعی زندگی کے لئے موزوں مناسب ہو۔

یہ مسئلہ جہاں ایک عظیم اہمیت کا حامل ہے اور اپنے حل و جواب کے لئے بے انتہا ذہنی کاوشوں کا طالب ہے، وہاں بڑی حد تک خطرناک بھی ہے۔ اس لئے کہ اس کا تعلق انسان کی ذات سے ہے اور اس کے حل کی ہر غلطی براہ راست انسانی معاشرہ پر اثر انداز ہو سکتی ہے۔

انسانیت کی تاریخ گواہ ہے کہ عہد ماضی میں اس مسئلے کی جڑیں بہت دور تک پھیلی ہوئی ہیں اور انسان نے اس کے حل کے لئے اس وقت سے جدوجہد شروع کی ہے جب انسانی آبادی چند آدمیوں میں محدود تھی اور ان کی زندگی چند محدود تعلقات پر بسر ہو رہی تھی، لیکن اس وقت بھی ایک ایسے نظام کی ضرورت محسوس ہو رہی تھی جو ان تعلقات کی حد بندی کر کے معاشرہ کو متوازن راہوں پر چلا سکے۔

دراصل اس مسئلہ نے فکر و سیاست کے میدان میں انسان کو ایک جہد مسلسل اور جہاد پیہم میں مبتلا کر رکھا ہے اور ہر دور کے انسان نے اپنی عقل و فکر کے مطابق اس کے حل تلاش کئے ہیں۔ مختلف عقلی مذاہب عالم وجود میں آئے۔ ان کے خطوط معین ہوئے۔ ان کی

راہیں استوار کی گئیں اور اس کے بعد وہ مذاہب رہ سپارِ ملکِ عدم ہو گئے۔ انسانیت کے حصہ میں مظالم آئے اور مصائب، مسکراہٹیں، آنسو نیک بختی اور بدبختی آئیں۔ یہی ملے جلے تر کے تھے جو ہر دور کے انسان کو ملتے رہے۔ حسن اتفاق کہئے یا خوبیٔ تقدیر کہ ہر دور میں کچھ روشنیاں بھی ملتی رہیں اور کچھ باصلاحیت ذہن بھی صفحہ تاریخ پر ابھرتے رہے، ورنہ انسانیت اسی دائمی عذاب میں مبتلا رہ جاتی اور معاشرہ انہیں موجوں کی زد پر تھپیڑے کھاتا رہتا۔

مجھے اس وقت میدان میں انسانی جہاد کی تاریخ نہیں دہرانی ہے اور نہ ماضی کی الم انگیز داستان کو دہرانا چاہتا ہوں۔ میرا مقصد دور حاضر کے حالات کا جائزہ لینا ہے اور اس آخری مرکز کی طرف توجہ دینا ہے جہاں تک انسان اتنی مسلسل کوششوں کے بعد پہنچ سکا ہے اور جس سے یہ اندازہ ہوسکتا ہے کہ ابھی کتنے چکر اور باقی ہیں اور ساحل کا طوفان سے فاصلہ کتنا ہے؟ وہ ساحل جہاں سلامتی کا مرکز ہو، اطمینان کا مستقر ہو اور عدل وخوش بختی کی حکومت۔

درحقیقت انسانی اجتماع کی مشکلات کا احساس جس قدر آج کے انسان کو ہے اتنا تاریخ کے کسی دوسرے دور میں نہ تھا۔ آج کا انسان موقف کی پیچیدگیوں کو کل سے زیادہ سمجھنے لگا ہے اور اب اسے یہ احساس بھی ہو گیا ہے کہ یہ مسئلہ اس کا پیدا کیا ہوا ہے۔ اجتماعی قوانین اس کے اوپر آسمان سے نہیں لادے جاتے ان کی حیثیت فطری قوانین کی نہیں ہوتی وہ زمین کی جاذبیت کی طرح کوئی ایسے قوانین نہیں ہیں جن کے آگے وہ بالکل بے بس اور بے اختیار ہو، جبکہ کل کا انسان بالکل یہی احساس رکھتا تھا اور وہ ان قوانین کے سامنے اپنے آپ کو بالکل بے بس خیال کرتا تھا۔

اس کا خیال تھا کہ یہ جاگیردارانہ نظام، یا غلامی کے قوانین آسمانی مقدرات ہیں جن کے آگے انسان اتنا ہی مجبور ہے جتنا آفتاب و ماہتاب کے آگے۔ وہ نہ آفتاب کی گرمی کو سردی سے بدل سکتا ہے نہ جاگیردارانہ نظام کو سرمایہ دارانہ بنا سکتا ہے۔ نہ ماہتاب کی خنکی چھین سکتا ہے نہ آقاؤں سے ان کی آقائی سلب کرسکتا ہے۔ لیکن آج کے انسان نے یہ محسوس کر لیا ہے کہ ایسا کچھ نہیں ہے۔ ہمارے دست و بازو میں اتنی طاقت ہے کہ ہم

انقلاب برپا کر کے ہر نظام کا جنازہ نکال سکتے ہیں اور معاشرہ کے لئے دوسرے نظام کو بھی مرتب کر سکتے ہیں۔(مترجم)

آج کا انسان جہاں سپردگی کی منزل سے نکل کر جہاد وانقلاب کی راہوں پر چل رہا ہے وہاں مادیت اور طبیعات کی گوناگوں ترقیوں نے اس کی فکر کو اور بھی پراگندہ کر رکھا ہے۔آئے دن نئی نئی ایجادات عالم ظہور میں آرہی ہیں روزانہ نئے ذرائع پیداوار وجود پا رہے ہیں اور ہر ایجاد کے ساتھ سماجی تنظیم کے لئے ایک نئی مشکل ابھرتی آرہی ہے اور اتنی بڑی پیداوار کی تقسیم ایک بھیانک مسئلہ کی شکل اختیار کرتی جارہی ہے۔یہ اور بات ہے کہ اس کے ترکے میں اسلاف کے تجربے بھی ہیں اور اس نے ان تجربات سے کافی فائدے بھی اٹھائے ہیں۔اس نے اجتماعی مسئلے کو حل کرنے کے لئے انہیں سابق تجربات کی روشنی میں کئی قدم بھی اٹھائے ہیں۔جن کا ہر قدم ہمارے مذکورہ بالا سوال کا جواب بنا ہے۔وہ کونسا اجتماعی نظام ہے جو انسانیت کے لئے صالح اور انسانی زندگی کے لئے موزوں ومناسب ہو۔

انسانیت اور مسئلہ کا حل

اجتماعی زندگی کے بنیادی مسئلے کو سمجھ لینے کے بعد ہمیں یہ دیکھنا پڑے گا کہ آج کا انسان اس مسئلے کو حل کرنے کے لئے کتنی استعداد وصلاحیت رکھتا ہے اور وہ کن کن شرائط و لوازم سے آراستہ ہے تاکہ صحیح طور پر یہ اندازہ ہو سکے کہ اس کے جواب میں کتنا وزن ہے۔ مثال کے طور پر ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ انسانی سماج کے لئے سرمایہ دارانہ نظام زیادہ مناسب ہے یا اشتراکی نظام؟ تو پہلے ان عناصر سے بحث کرنا پڑے گی جن کی بنیاد پر مناسب اور نامناسب کا فیصلہ کیا جائے۔پھر ان اصول وقوانین پر غور کرنا پڑے گا جن کے بغیر کوئی نظام صالح ومناسب نہیں ہوسکتا اور ان تمام منزلوں سے گزرنے کے بعد یہ دیکھنا ہوگا کہ آیا صالح نظام کا دریافت کر لینا اس کی تطبیق اور اس کے رواج کے لئے کافی ہوگا یا رواج ونفاذ کے لئے کچھ اور بھی شرائط ضروری ہیں جو بسا اوقات ان لوگوں کو بھی میسر نہیں ہوتیں جو اپنی ذہنی صلاحیت کی بنا پر صالح نظام کے دریافت کی قدرت رکھتے ہیں اور کھلی ہوئی بات ہے کہ یہ

بات بڑی حد تک ایک فلسفی بحث سے مربوط ہے جس کا عنوان ہے ''انسانی اجتماع کیا ہے؟'' اس کائنات سے اس کا رابطہ کیا ہے؟ انسان کے داخلی و خارجی محرکات کیا ہیں؟ انسانی زندگی کن عناصر سے قائم ہوتی ہے؟ سماجی زندگی کے لئے کن باتوں کی ضرورت پڑتی ہے۔؟ تاکہ ان سب کی روشنی میں دیکھا جائے کہ کس نظام میں رواج و نفاذ کی صلاحیت ہے اور کس میں نہیں ہے۔

مارکس ازم

مارکسیت کا خیال ہے کہ انسان فکرونظر کے اعتبار سے اپنے دور کے ذرائع پیداوار کا پابند ہوا کرتا ہے۔ وہ ان ذرائع سے الگ ہو کر سوچنے سمجھنے کی بھی کوئی صلاحیت نہیں رکھتا۔ صالح نظام کی فکر بھی اس کے ذہن میں اسی سماج کی پیداوار ہوگی جس میں وہ زندگی بسر کر رہا ہے۔ مثال کے طور پر یوں سمجھئے کہ ہوائی چکی نے اس کے ذہن میں یہ بات ڈالی تھی کہ جاگیردارانہ نظام صالح نظام ہے۔

بھاپ کے دور نے یہ فکر پیدا کی کہ سرمایہ دارانہ نظام زیادہ صالح ہے اب ذراتی اور برقی طاقتیں یہ القاء کر رہی ہیں کہ صحیح و صالح نظام صرف اشتراکیت ہے گویا کہ صالح نظام کا ادراک دوسرے الفاظ میں ذرائع پیداوار کے ادراک کے مترادف ہے۔ جیسے جیسے ذرائع پیداوار کا ادراک بڑھتا جائے گا ویسے ویسے صالح سے صالح تر نظام کا ادراک پیدا ہوتا جائے گا۔

رہ گئی نظام کے صالح ہونے کی ضمانت۔؟ تو اس کی واحد ضامن و ذمہ دار وہ تاریخ ہے جس کی حرکت ہمیشہ آگے کی طرف ہوتی ہے اور جو ہمیشہ اپنے ہر موڑ پر ایک ترقی یافتہ شکل پیش کرتی ہے۔ نظام کا تازہ ہونا ہی اس کی صحت و درستی کا واحد ذمہ دار ہے۔ یہ اور بات ہے کہ بعض فکریں بعض اوقات تازہ معلوم ہوتی ہیں اور تھوڑے ہی دن میں یہ انکشاف ہو جاتا ہے کہ یہ بات کسی پرانی فکر کی صدائے بازگشت ہے جس نے نیا روپ دھار کر سماج کو دھوکا دیا ہے جیسے کہ ہٹلر ازم کا حال تھا کہ وہ بظاہر نئی بات تھی اور سماج اسے صالح سمجھ رہا تھا

لیکن تھوڑے ہی دنوں میں واضح ہو گیا کہ یہ فکر صالح ہونے کے بجائے مفسد اور تباہ کن ہے۔

رواج و نفاذ کے مرحلے میں مارکسیت کا عقیدہ ہے کہ نظام کا صالح اور انسب ہونا اس کے رواج کا ذمہ دار نہیں ہے اور نہ رواج کوئی تاریخی جبر ہے۔ بلکہ اس کے لئے ضروری ہے کہ اس فکر کے پرستار اکثریت میں ہوں۔ سماج پر ان کا غلبہ و قبضہ ہو، ان کی آواز سننے کے قابل ہو، تا کہ اس طرح مرحوم نظام کے پرستاروں سے ٹکر لی جا سکے۔ اور جدید نظام کو رائج کیا جا سکے۔ محل بحث میں یوں کہا جائے کہ اشتراکی نظام کے رواج کے لئے مزدور طبقہ کا غلبہ اور اقتدار انتہائی ضروری ہے جب تک یہ طبقہ اتنا اثر و رسوخ نہ پیدا کر لے کہ سرمایہ دار ذہنوں کا استحصال کر سکے۔ اس وقت تک اشتراکی نظام کے رواج کا کوئی سوال ہی نہیں پیدا کرتا۔

درحقیقت مارکسیت کا یہ سارا فلسفہ اس کے ''مادیت تاریخ'' کے نظریہ پر قائم ہے جس کی تفصیلی تردید ہماری کتاب ہمارے اقتصادیات میں کی جا چکی ہے یہاں پر صرف اتنا اضافہ کرنا ہے کہ خود تاریخ بھی اس نظریہ کی ساتھی نہیں ہے۔ بلکہ وہ بھی صالح نظام کی تشکیل میں ذرائع پیداوار سے ہٹ کر انسان کو ایک مستقل حیثیت دیتی ہے اور اس کا بیان ہے کہ انسان نے ہر دور میں اپنی فکری اور عقلی صلاحیتوں کی بنیاد پر صالح نظام کی تشکیل کی ہے، چاہے اس دور کے ذرائع پیداوار کچھ بھی رہے ہوں خود قومی ملکیت، اشتراکیت، حکومتی ملکیت کے نظریات بھی تاریخ کے سابق ادوار میں منظر عام پر آ چکے ہیں۔ جب کہ ذرائع پیداوار کے اس حد تک ترقی کرنے کا کوئی امکان ہی نہ تھا۔ میں نہیں سمجھ سکتا کہ مارکسیت اس دور کے نظام کی کیا تاویل کرے گی۔ تاریخ گواہ ہے کہ افلاطون خود بھی اشتراکیت کا دلدادہ تھا اس نے جس مدنیہ فاضلہ کا تصور پیش کیا تھا اس کی بنیاد بھی اشتراکیت پر تھی تو کیا اس ترقی یافتہ فکر کو بھی ترقی یافتہ ذرائع پیداوار کا نتیجہ قرار دیا جا سکتا ہے؟

یہی نہیں بلکہ اشتراکیت کی فکر آج سے تقریباً دو ہزار برس سے پہلے بعض مفکرین کے ذہنوں میں اس قدر راسخ ہو گئی تھی کہ انہوں نے اسے اپنے دور پر منطبق بھی کیا تھا اور

اس کے اثرات کا مشاہدہ بھی کیا تھا چنانچہ چین میں ہان خاندان کا عظیم فلسفی دو۔ وی اشتراکیت کو باقاعدہ طور پر صالح نظام زندگی سمجھتا تھا اور اس نے ۱۴۰۔ ۸۷ ق م تک اسے منطبق بھی کیا تھا طبیعی پیداوار امت کی ملکیت بن گئی تھی۔ نمک لوہا، اور شراب کی صنعتوں کو قومی ملکیت قرار دے دیا گیا تھا۔ حکومتی پیمانے پر حمل ونقل کے ایسے ذرائع پیدا ہو گئے تھے جن سے اوسط درجے کے تاجروں کی تجارت کا خاتمہ ہو جائے اور تجارت صرف حکومتی پیمانے پر ہو، تاکہ غنیمت مواقع پر زیادہ قیمتیں نہ بڑھائی جاسکیں۔ حکومت کے ملازم تمام شہروں میں مال سپلائی کرتے تھے۔ ارزانی کے دور میں خریدتے تھے اور گرانی کے دور میں عوامی سہولت کا لحاظ رکھتے ہوئے فروخت کر دیتے تھے۔ بڑے بڑے کارخانے اس بنیاد پر کھول دیئے گئے تھے کہ انفرادی طور پر کاروبار کرنے والے اس کارخانہ میں کام کرسکیں۔

یہی حال مسیحی تاریخ کے آغاز میں وانج مانج کا تھا۔ اس نے بھی غلامی کے نظریہ کو مہمل قرار دیتے ہوئے جاگیردارانہ نظام کو بیکار ثابت کر دیا تھا۔ جاگیردار سے زمینیں چھین کر لوگوں پر تقسیم کی جارہی تھیں۔ زمینوں کی خرید وفروخت حرام ہو گئی تھی۔ کانیں اور بڑی صنعتیں قومی ملکیت کی شکل اختیار کر گئی تھیں اور معاشرہ آج کے دور سے قریب تر ہو چکا تھا۔ تو کیا ان حالات کی بھی مارکسی تفسیر کی جاسکتی ہے اور یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ فکریں بھاپ، دھواں بجلی یا ایٹمی ذرائع پیداوار کا نتیجہ تھیں؟ ہرگز نہیں۔ ماننا پڑے گا کہ صالح نظام کا تصور وادراک ذرائع پیداوار کی وسعت وترقی کا مرہون منت نہیں ہے بلکہ دونوں کی راہیں الگ الگ ہیں اور دونوں اپنے اپنے حالات کی بنیاد پر آگے بڑھتے ہیں۔

یہی حال مارکسیت کی ارتقائی حرکت کا ہے جس نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ ہر جدت صحت کی ضمانت ہے اور نئی فکر صحیح وصالح ہوا کرتی ہے اس لئے کہ یہ صرف ایک خیالی بات ہے ورنہ تاریخ میں معاشروں کے انحطاط پذیری کی داستانیں بکثرت موجود ہیں جن کا انکار ممکن نہیں ہے۔

غیر مارکسی مفکرین

غیر مارکسی مفکرین کا خیال ہے کہ صالح نظام کا تصور و ادراک خود معاشرتی تجربات سے حاصل ہوتا ہے انسان جب ایک نظام کو معاشرہ پر منطبق کرتا ہے تو تھوڑے عرصے میں اس کی تمام خوبیاں اور خرابیاں اس کی نظروں کے سامنے آجاتی ہیں اور اسے یہ محسوس ہوجاتا ہے کہ اس کی فکر نے کہاں کہاں ٹھوکر کھائی ہے، پھر وہ انہیں تجربات کی روشنی میں نئی فکر کرتا ہے اور ایک جدید نظام کی تشکیل کرتا ہے جو خود بھی تجربہ گاہ حیات میں لایا جاتا ہے اور اس کے عیوب و محاسن کا اندازہ کیا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ ٹھوکریں کھاتے کھاتے انسانی فکر اس منزل تک پہنچ جاتی ہے جس کا سوچا ہوا نظام یقیناً صالح نظام ہوتا ہے۔اس بنیاد پر صالح نظام کا مسئلہ بالکل ایسا ہی ہے جیسے طبیعی دنیا میں یہ سوال اٹھایا جائے کہ مکان کو گرم رکھنے کا صالح ترین طریقہ کون سا ہے؟ ظاہر ہے کہ انسان جس زمانے میں پہاڑوں کے غار میں زندگی گزارر ہا تھا اس وقت بھی اسے سردی محسوس ہوتی تھی اور وہ مکان کو گرم کرنے کی فکر میں مشغول تھا۔اس وقت کے حالات نے اسے آگ کی ایجاد کی رہنمائی کی پھر رفتہ رفتہ تجربات سے اس کا ذہن آگے بڑھتا رہا اور آج یہ طے ہوگیا کہ مکان گرم رکھنے کا بہترین طریقہ برقی آلات کا استعمال ہے۔

یہی حال ٹی بی کے لئے بہترین دوا کی تلاش، تیل نکالنے کے لئے بہترین آلات کی تحقیق، حمل ونقل کے لئے تیز تر سواریوں کے انتظام کا تھا کہ پہلے انسان نے معمولی ذرائع سے کام لیا پھر اپنے متعدد تجربات سے فائدہ اٹھا کر جدید ترین آلات ایجاد کردیئے۔

ظاہر ہے کہ جو انسان اتنے ترقی یافتہ ذرائع زندگانی ایجاد کرسکتا ہے وہ اس بات پر بھی قادر ہے کہ مختلف سماجی تجربات کے بعد سماج کے لئے ایک صالح وصحیح نظام ایجاد کردے جس کے زیر سایہ انسانیت امن وسکون کی زندگی گزار سکے۔

طبیعی اور سماجی تجربات کا فرق

یہ صحیح ہے کہ طبیعی تجربات کی طرح اجتماعی تجربات بھی انسان کی ذہنی صلاحیتوں میں بڑی حد تک اضافہ کردیتے ہیں اور وہ پہلے سے بہتر سوچنے کے قابل ہو جاتا ہے، لیکن مسئلہ کی گہرائیوں تک پہنچنے کے لئے ہمیں یہ دیکھنا پڑے گا کہ طبیعی تجربات اور سماجی تجربات میں زمین وآسمان کا فرق ہے۔

ٹی بی کی دوا، حمل ونقل کا ذریعہ، تیل نکالنے کا آلہ یا اس قسم کے دیگر مسائل میں تجربہ اتنا دشوار نہیں ہے جتنا دشوار کسی سماجی نظام کا تجربہ ہے۔ دونوں تجربات میں الگ الگ صلاحیتوں کی ضرورت ہوتی ہے اور یہ کوئی ضروری نہیں ہے کہ جس انسان میں ایک قسم کی صلاحیت پائی جاتی ہو اس میں دوسرے قسم کی صلاحیت بھی ضرور ہو۔ طبیعی تجربات کی رفتار انتہائی تیز تر ہوتی ہے اور ہر تجربہ اس کی رفتار کو مزید تیز وتند بنا دیتا ہے لیکن اجتماعی تجربات کی رفتار انتہائی سست ہوتی ہے اور وہ کبھی بھی طبیعی تجربہ کا ساتھ نہیں دے سکتے۔ بحث کو مکمل کرنے سے پہلے ہمیں ان تفرقوں پر بھی غور کرنا پڑے گا۔ جو ایک تجربے کو دوسرے سے الگ کرتے ہیں اور جن کی بنیاد پر یہ واضح ہو جاتا ہے کہ طبیعی تجربات اور ہیں اور سماجی تجربات اور۔ ان کی رفتار اور ہے اور ان کی رفتار اور ان کی صلاحیت اور ہے اور ان کی صلاحیت اور.................اور مختصر یہ کہ ان کی دنیا اور ہے اور ان کی دنیا اور

تجربات کے فرق

طبیعی اور اجتماعی تجربات کے فرق حسب ذیل دفعات میں بیان کئے جاسکتے ہیں۔

﴿۱﴾ طبیعی تجربہ کو ایک تنہا انسان بھی انجام دے سکتا ہے وہ لیبارٹی میں بیٹھ

کر مختلف قسم کے اعمال انجام دے کر یہ دیکھ سکتا ہے کہ ان اعمال کے نتائج کیا ہوتے ہیں اور اس تجربہ سے کتنا فائدہ ہوتا ہے اور کتنا نقصان.......لیکن اجتماعی تجربہ ایک انسان کے بس کی بات نہیں ہے.......اجتماعی تجربے کے معنی یہ ہیں کہ ایک پورے نظام کو ایک پورے معاشرے پر منطبق کیا جائے اور پھر یہ دیکھا جائے کہ جاگیردارانہ نظام یا سرمایہ دارانہ نظام تاریخ کے اس ایک معین دور میں کیا اثرات دکھلاتا ہے اور اس پورے معاشرہ کو ترقی یا تنزل کے کس راستے پر لے جاتا ہے۔ظاہر ہے کہ ان تمام حادثات میں ایک انسان تنہا شریک نہیں ہوسکتا، اسے ضرورت ہوگی کہ چند حادثات کا تجربہ کرنے کے بعد باقی کے لئے اپنے فکری رحجانات یا دوسروں کے تاریخی بیانات پر اعتماد کرے۔(دوسرے لفظوں میں یہ کہا جائے کہ کسی نظام کو آزمانے کے لئے یہ دیکھنا پڑتا ہے کہ اس نظام کا اثر غریب، امیر، کسان، مالک، مزدور، سرمایہ دار، استاد، شاگرد، مالک مکان، کرایہ دار، حمال بقال، نداف، قصاب اور دیگر طبقات پر کیا پڑتا ہے؟ اور ظاہر ہے کہ ایک آدمی ایک وقت میں یہ سب کچھ نہیں کرسکتا۔ پھر یہ تو اس تجربہ کی بات ہے جو صرف اتنے دنوں قائم رہے جتنے دن تجربہ کرنے والا بقید حیات رہے جبکہ اجتماعی تجربات کئی کئی صدی کے محتاج ہوتے ہیں اور ایک انسان کی عمر اس قدر وفا نہیں کرسکتی۔

اس لئے ماننا پڑے گا کہ اجتماعی تجربہ ایک دو آدمیوں کے بس کی بات نہیں ہے اس میں ہر شخص دوسرے افراد نوع پر اعتماد کرنے کا محتاج ہے۔(مترجم)

﴿۲﴾ طبیعی تجربے کے سانچے سے ڈھلی ہوئی فکر اجتماعی تجربہ کی پیداوار سے کہیں زیادہ پاکیزہ اور صحیح ہوتی ہے جس کی بنیاد پر اجتماعی تجربہ کبھی طبیعی تجربہ کا ہم وزن نہیں قرار دیا جا سکتا اور یہ دونوں کا بڑا بنیادی فرق ہے جس پر توجہ دینا انتہائی ضروری ہے۔ اس فرق کا راز یہ ہے کہ طبیعی تجربہ میں انسان کی نظر صرف انکشاف پر ہوتی ہے اور عام طور سے اس کی کوئی غرض اس امر سے وابستہ نہیں ہوتی کہ حقیقت کا چہرہ مسخ کر دیا جائے۔ یا نتیجہ

کی شکل بدل دی جائے۔ وہ تو صرف یہ دیکھنا چاہتا ہے کہ ٹی بی کے جراثیم پر فلاں دوا ڈال دی جائے تو اس کا اثر کیا ہوگا اور وہ جراثیم کس حد تک زندہ رہ سکیں گے۔ اسے اس سے کوئی واسطہ نہیں ہوتا کہ ٹی بی میں مبتلا کون اور کس طبقہ کا انسان ہوگا۔ اس کے حالات کیا ہوں گے۔ میرے اس سے روابط وتعلقات کیسے ہیں......لیکن اجتماعی تجربہ میں ایسا کچھ نہیں ہوتا۔ وہاں اکثر ایسا ہوتا ہے کہ تجربہ کرنے والے کے ذاتی مصالح حقیقت کو پوشیدہ کردینے پر مجبور کردیتے ہیں اور وہ تجربہ کے ساتھ انصاف نہیں کرپاتا۔ مثال کے طور پر یوں سمجھئے کہ اگر کسی شخص کے ذاتی فوائد سرمایہ داری، ذخیرہ اندوزی، یا سودخواری سے وابستہ ہیں تو اس سے کیا امید کی جاسکتی ہے کہ وہ اپنے تجربہ میں ان چیزوں کے سماجی نقصانات کی نشان دہی کرے گا اور ان کی مخالفت ہی کو صالح نظام کی شکل میں پیش کرے گا۔ اس سے تو یہی امید کی جاسکتی ہے کہ وہ حقیقت کے چہرے کو مسخ کردے اور نتیجہ کو خواہش کے سانچے میں ڈھال دے۔

یہی حال اس شخص کے تجربے کا ہوگا جس کے ذاتی مصالح ان چیزوں کی مخالفت سے وابستہ ہیں۔ ظاہر ہے کہ وہ اپنے تجربے میں اپنے ذاتی رجحانات سے متاثر ہوکر ان کی مخالفت میں فیصلہ دے گا، چاہے یہ چیزیں کتنی ہی زیادہ سودمند اور منفعت بخش کیوں نہ ہوں.........یہی وجہ ہے کہ اجتماعی تجربے کے کسی بھی نتیجے کو کامل وثوق واطمینان کے ساتھ حقیقت کا درجہ نہیں دیا جاسکتا بلکہ اس کے لئے ضروری ہوگا کہ تجربہ کرنے والے کے ذاتی حالات پر بھی نظر رکھی جائے اور اس طرح تجربہ بے قیمت ہوکر رہ جائے گا۔

﴿۳﴾ اگر یہ تسلیم بھی کرلیا جائے کہ انسان کسی وقت اپنے ذاتی رجحانات اور شخصی میلانات سے الگ بھی ہوسکتا ہے اور وہ صالح نظام کے ادراک میں غیر جانبداری سے کام لے سکتا ہے تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ صالح نظام کے ادراک کے بعد جب اس کی تطبیق کا سوال اٹھے گا تو اس وقت وہ شخص تطبیق میں کیسے مدد دے گا جس کا مزاج اس صالح نظام سے ہم آہنگ نہیں ہے۔ مثال کے طور پر یوں سمجھ لیجئے کہ آج کا مغربی انسان اگر اپنے

بیشمار تجربات سے یہ فیصلہ بھی کر لے کہ عورت و مرد کا موجودہ اختلاط انسانی سماج کے لئے سم قاتل کی حیثیت رکھتا ہے تو کیا اس کا یہی فیصلہ اسے اس بات پر آمادہ کر دے گا کہ وہ اس اختلاط کے کاتمہ کی کوشش کرے اور موجودہ صورتحال کو بدل ڈالے جبکہ اس اختلاط سے اس کے سینکڑوں جنسی منافع وابستہ ہیں اسی سے تسکین نظر کا سامان بہم ہوتا ہے، اسی سے لمس کی لذت حاصل ہوتی ہے اسی حسن کی آنچ سے عشق کی سینک ہوتی ہے اور اس طرح کے سینکڑوں جنسی فوائد ہیں جن کا اندازہ وہی افراد کر سکتے ہیں جو اس اختلاط سے دو چار ہوں اور جن کی زندگی اس جنسیت کی نذر ہو چکی ہو۔

مقصد یہ ہے کہ ہمیں صرف صالح نظام کے ادراک کی ضرورت نہیں ہے بلکہ ان فطری رجحانات کی بھی ضرورت ہے جو انسان کو اس نظام پر عملدرآمد کرنے کے لئے مجبور کر سکیں اور جن کے بعد بغاوت کے جذبات پسپا اور پامال ہو جائیں۔

﴿۴﴾ جس نظام کو کسی معاشرہ کا انسان ترتیب دیتا ہے اور اسے اس معاشرہ کے لئے صالح و سودمند تصور کرتا ہے وہ اس کی تربیت اور اس کی آفاقی ترقی کے لئے یقیناً ناکافی ہوا کرتا ہے۔ اس لئے کہ انسانی تنظیم انسانی صلاحیت و استعداد کی آئینہ دار ہوا کرتی ہے۔ اس کی پشت پر وہی ارادہ و عزم کام کرتا ہے جو اس مخصوص معاشرہ کی پیداوار ہوتا ہے۔ لہٰذا اگر معاشرہ ضعیف الارادہ ہے تو اس معاشرہ کا ایجاد کیا ہوا نظام قوت ارادی کی تربیت کے لئے مفید نہیں ہو سکتا، وہ تو ایسے ہی نظام کو ایجاد کرے گا جو اس کے ضعف ارادہ کا آئینہ دار اور اس کی فطری اور فکری کمزوری کا ترجمان ہو۔ مثال کے طور پر یوں سمجھ لیجئے کہ جو سماج شراب کی معمولی کشش کے مقابلہ میں اپنے ارادہ پر قابو نہیں پا سکتا، چھوٹی سی لذت کو ترک کرنے پر قادر نہیں ہے، اس سماج سے کیا امید کی جا سکتی ہے کہ وہ ایسے سخت نظام کو رائج کر دے گا جو اس قسم کی تمام لذتوں پر پابندی عائد کرتا ہو اور نفس کو خواہشات سے آزادی دلا سکتا ہو؟

خواہشات کی رو پر بہنے والے سماج سے قوت ارادی کی امید رکھنا خیال و جنون

کی حیثیت رکھتا ہے شراب سے چھٹکارا نہ پا سکنے والے انسان سے خواہشات کی مخالفت کی توقع کرنا انتہائی مہمل بات ہے۔ چاہے وہ شراب کے نقصانات سے کسی حد تک واقفیت کیوں نہ رکھتا ہو اور اس کا کتنا ہی احساس کیوں نہ کرتا ہو۔ اس لئے کہ نقصانات کا احساس اسی وقت شدید ہوگا جب شراب کا استعمال زیادہ مقدار میں ہوگا اور شراب کا زیادہ مقدار میں استعمال ہی انسان کی قوت ارادی کے سلب ہو جانے کا باعث ہے، لہٰذا شرابی کسی وقت بھی خواہشات کے طوفان کو روکنے پر قادر نہیں ہوسکتا اور نہ خواہش کے مخالف نظام کو رائج کر سکتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ انسانی تمدن کسی وقت بھی ایسے قانون کو نافذ نہیں کر سکا جو انسان کو خواہشات کی غلامی سے آزادی دلا کر اسے صحیح انسانیت کی سطح تک پہنچا سکتا۔ آج کے انتہائی ترقی یافتہ متمدن ملک امریکہ ہی کو دیکھ لیجئے کہ وہ ''حرمت شراب'' کے قانون کو نافذ کرنے سے بہر طور پر عاجز ہو چکا ہے اور اس کا سبب یہی ہے کہ خواہش پرست سماج کبھی خواہش کے خلاف نظام برداشت نہیں کر سکتا اور انسانیت کو اس قعر مذلت سے نجات نہیں دلا سکتا۔

حالانکہ اسی کے برخلاف یہ اسلام کی روحانی تربیت تھی کہ اس نے تھوڑے ہی عرصے میں ایک پورے معاشرہ سے شراب جیسی تمام لعنتوں کو دور کر دیا اور انسان کے اندر قوت ارادی کو انتہائی مستحکم بنا دیا۔

طبیعی اور اجتماعی تجربات کا فرق واضح کرنے کے بعد ایک دوسرا سوال بھی پیدا ہوتا ہے جس کا جواب دینا بھی تکمیل بحث کے لئے انتہائی ضروری ہے۔ سوال یہ ہے کہ معاشرتی زندگی کی تنظیم اور اجتماعی حیات کی تشکیل کے لئے طبیعی علم سے کس حد تک فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔ فزکس اور کیمسٹری کے تازہ ترین تحقیقات اجتماعی نظام کے ادراک میں کہاں تک مددگار ثابت ہو سکتے ہیں؟ یا دوسرے لفظوں میں یہ کہا جائے کہ کیا طبیعی اور تجرباتی علوم کی ترقی صالح نظام کے ادراک کے مسئلے میں انسانی تاریخ کے مطالعہ سے بے نیاز بنا سکتی ہے؟ اور کیا یہ ممکن ہے کہ ماضی قدیم کے حالات کو تاریخ کے آئینہ میں دور سے

دیکھنے کے بجائے فزکس اور کیمسٹری کے تازہ ترین انکشافات کی روشنی میں اجتماعی نظام قائم کرلیا جائے؟۔

بعض خوش فہم لوگوں کا خیال ہے کہ مغرب کی یہ روز افزوں ترقی یقیناً انسان میں اتنی صلاحیت پیدا کرسکتی ہے کہ وہ اپنی اجتماعی زندگی کی تنظیم انہیں ترقیات کی روشنی میں لے کر اور کسی گزشتہ دور کے مطالعے کی ضرورت نہ پڑے اس لئے کہ اجتماعی نظام اسی نظام کا نام ہے جو انسانوں کی ضروریات کو بہتر سے بہتر طریقے سے پورا کر سکے اور انسانی ضروریات واقعی حیثیت رکھتے ہیں، جن کا صحیح اندازہ جدید علوم کی روشنی میں کیا جا سکتا ہے۔ ان انکشافات سے یہ پتہ لگایا جاسکتا ہے کہ ان ضروریات کو پورا کرنے کے لئے کن اعمال کی ضرورت ہے اور ان اعمال کے اثرات کیا ہیں؟ اور جب یہ سب کچھ ممکن ہے انسانی ضروریات قیاس میں آسکتی ہیں۔ انہیں پورا کرنیوالے افعال بھی محدود حیثیت رکھتے ہیں۔ ان افعال کے اثرات بھی حساب میں آنے کے قابل ہیں تو یہ کیونکر ممکن نہیں ہے کہ چند اشخاص کا تجربہ کرکے انسان کے تمام طبیعی حیاتیاتی عوامل کا پتہ لگا لیا جائے۔ ان کے کاموں کا اندازہ کرلیا جائے اور ان کی روشنی میں ایک ایسا نظام مرتب کرلیا جائے جو افراد کی عقلی اور فکری صلاحیتوں کی تربیت کر سکے۔

بعض لوگ تو اور بھی آگے بڑھ گئے ہیں اور ان کا خیال ہے کہ یہ بات ممکن ہی نہیں ہے بلکہ یورپ کے جدید ترین تمدن میں واقع بھی ہوئی ہے۔ اس نے مذہب، اخلاق اور اس قسم کے تمام فکری اور اجتماعی مقولات کو ترک کرنے کے بعد اپنی زندگی کو علمی انکشافات کی بنیاد پر منظم کرنے کی کوشش کی ہے اور انسانیت کے لئے ایک راستہ تلاش کیا ہے جس سے آسمانوں کے دروازے کھل گئے ہیں اور زمین خزانے اگلنے لگی ہے۔

اس مقام پر ہمارا فرض ہو جاتا ہے کہ اصل مسئلہ کو حل کرنے سے پہلے ان خوش اعتقادیوں پر ایک نظر کرتے جائیں اور یہ واضح کر دیں کہ یورپ کے اس جدید تمدن کو علمی انکشافات سے کوئی واسطہ نہیں ہے، ان کے جملہ قوانین و قواعد نظریاتی ہیں، جن کی بنیاد فلسفی

اصول اور مخصوص عقائد پر ہے۔ انہیں فزکس کے تجربات اور کیمسٹری کے تجزیہ سے کوئی واسطہ نہیں ہے۔ اس کی پشت پر نہ انسانی ضروریات کا حساب لگایا گیا ہے اور نہ ان ضروریات کو پورا کرنے والے اعمال کا........ان کی انقلابی تاریخ کا بغور مطالعہ کرنے والا جانتا ہے کہ مادی میدانوں میں ان کا عام نظریہ اجتماعی اور تنظیمی میدان کے عمومی خیال سے بالکل الگ ہے اور وہ مادی میدان میں تجربات ومشاہدات کے قائل ہیں........ پانی کی ترکیب، ہوا کا وزن، جذب کی صلاحیت، ایٹم کا تجزیہ یہ تمام باتیں انہوں نے تجربے سے سیکھی ہیں۔لیکن اجتماعی اور معاشرتی میدان میں ایسا کچھ نہیں کیا۔ یہاں کی عقل چند نظریاتی افکار سے منظم ہوئی ہے۔ انہوں نے انقلاب کے بعد انسانی حقوق کا اعلان کیا حالانکہ حق کا تصور خود ہی غیر تجرباتی ہے۔ دنیا جانتی ہے کہ انسانی آزادی جو اس اعلان کا بنیادی رکن ہے کوئی قابل حساب وقیاس شئے نہیں ہے۔ حساب صرف ضروریات کا ہوسکتا ہے حریت وآزادی کا نہیں، بلکہ اسی کے ساتھ ساتھ جب معاشرے کے افراد کے درمیان مساوات کا قانون دیکھا جاتا ہے تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ اس کا کوئی تعلق جدید انکشافات سے نہیں ہے۔ ان انکشافات میں کبھی ایسا کوئی تجربہ نہیں کیا گیا بلکہ اگر تجربہ کیا جاتا تو صاف واضح ہوجاتا کہ تمام افراد سوائے انسانیت کے کسی چیز میں برابر نہیں ہیں ہر ایک کی فکری، عقلی، نفسیاتی، حیاتیاتی صلاحیت الگ ہے اور ہر ایک کی باطنی داخلی استعداد جدا........ یہ قانون صرف ایک اخلاقی قانون ہے جس کو علمی تجربات سے دور کا بھی لگاؤ نہیں ہے، جس کا صاف سا مطلب یہ ہے کہ علمی تجربات اور اجتماعی تنظیم یہ دو الگ میدان ہیں۔ یورپ نے علمی تجربات میں ضرور ترقی کی ہے لیکن یہ ترقی اجتماعی تنظیم کو شامل نہیں ہوسکی۔ اور نہ یورپ نے اس سے سیاست اقتصادت یا اجتماع کے کسی میدان میں کوئی فائدہ اٹھایا ہے۔

ہمارا مقصد اس بیان سے صرف مغرب کی صورتحال کا واضح کرنا ہے۔ ہم مغربی تمدن پر کوئی اعتراض نہیں کرنا چاہتے کہ اس نے اپنے اجتماعی نظام کی تشکیل میں اپنے علمی تجربات سے کوئی فائدہ نہیں اٹھایا یا اپنے نظام کو ان تجربات کی بنیاد پر نہیں مرتب کیا، اس

لئے کہ ہماری نظر میں علمی تجربات کی بنیاد پر اجتماعی نظام کی تشکیل قطعی ناممکن ہے۔

یہ صحیح ہے کہ انسانی ضروریات ممنون تجربہ ہو سکتی ہیں، اور یہ بھی صحیح ہے کہ ان ضروریات کو پورا کرنے کے طریقے تجربے میں آسکتے ہیں لیکن مشکل یہ ہے کہ اجتماعی نظام میں مسئلہ اس فرد یا اس فرد کے ضروریات کو پورا کرنے کا نہیں ہے بلکہ یہاں سارا مسئلہ یہ ہے کہ پورے سماج کے ضروریات کے درمیان توازن کیونکر پیدا کیا جائے اور وہ کون سے روابط وتعلقات ہوں جن کی بنیاد پر تمام افراد کی ضرورتیں پوری ہوسکیں.........اب ظاہر ہے کہ افراد کے ضروریات کو پورا کرنے کے تجربے ایسا ماحول نہیں بنا سکتے اور نہ تعلقات کی تحدید کر سکتے ہیں۔ یہ تو صرف اسی وقت ہوسکتا ہے جب ایک معاشرے پر ایک نظام کو نافذ کیا جائے اور پھر اجتماعی تجربے سے اس کے محاسن وعیوب کا اندازہ کیا جائے تا کہ یہ معلوم ہو سکے کہ کن طریقوں سے یہ توازن قائم ہوسکتا ہے اور کس طرح معاشرہ واصلاح وسکون کی راہوں پر چل سکتا ہے۔

اسی کے ساتھ ساتھ یہ بات بھی پیش نظر رکھنا ہوگی کہ بعض ضرورتیں یا کمزوریاں دو ایک عملی تجربوں سے معلوم نہیں ہونگی۔ بلکہ ان کے لئے ایک پورے اجتماعی تجربے کی بہر حال ضرورت ہوگی۔ مثال کے طور پر یوں سمجھ لیجئے کہ ایک شخص بدکاری اور زنا کا عادی ہے لیکن جسمانی طور پر اس کے جسم میں کوئی عیب یا نقص نہیں ہے لیکن یہی بات جب ایک پورے معاشرے میں پیدا ہو جاتی ہے اور پورا سماج خواہشات کی رو پر بہنے لگتا ہے تو تھوڑے ہی عرصے کے بعد اس کی روحانیت پاش پاش ہو جاتی ہے۔ تہذیبی جرأت ختم ہو جاتی ہے اور ادارے کی قوت، فکر کی جودت فنا کے گھاٹ اتر جاتی ہے......ظاہر ہے کہ یہ بات دو ایک آدمیوں کے حالات سے دریافت نہیں کی جاسکتی بلکہ اس کے لئے کافی عرصے تک ایک ایسے سماج کا مطالعہ کرنا پڑے گا جو زنا کا عادی اور بدکاری کا خوگر ہو تا کہ اس کے مفاسد نگاہوں کے سامنے آسکیں اور فحاشی کا صحیح نتیجہ معلوم ہو سکے۔

اس کے علاوہ ایک بات یہ بھی ہے کہ ایسے حالات میں اجتماعی تجربہ کی طرح طبیعی

تجربہ بھی بدنام ہوجائے گا اس لئے کہ اجتماعی تجربہ نفسیات کا پابند ہوجایا کرتا ہے۔اب اگر اجتماعی تجربہ بھی طبیعی تجربہ کے سانچے میں ڈھل جائے گا تو طبیعی تجربہ بھی اپنی پا کیزگی کو کھو بیٹھے گا اور انسان اس تجربے میں بھی خواہش کا پابند ہوجائے گا جو انسان اور انسانیت کے لئے بے حد ضرر رساں شے ہے۔

تفصیلی گفتگو

صالح نظام کے ادراک اور اجتماعی تنظیم کی دریافت کے بارے میں انسان کی فکری صلاحیتوں کا جائزہ لینے کے بعد ہم ان نظاموں کے سلسلے میں گفتگو کرنا چاہتے ہیں جو آج کی دنیا کے ذہنوں پر چھائے ہوئے ہیں اور جن کے درمیان فکری یا سیاسی کشمکش موجود ہے........ایسے نظام چار قسم کے ہیں:۔

﴿۱﴾ سرمایہ داری ﴿۲﴾ اشتراکیت
﴿۳﴾ اشتمالیت ﴿۴﴾ اسلام

ان میں تین نظام وہ ہیں جو انسانی صلاحیت کے آئینہ دار اور انسانی فکر کی پیداوار ہیں۔ انہیں افراد نوع نے اس ایک بنیادی سوال کے جواب میں وضع کیا ہے کہ "اجتماعی زندگی کے لئے صالح نظام کون سا ہے"؟ ہر نظام اپنے وضع کرنے والے کی ذہنی صلاحیت کا عکاس اور اس کی فکری استعداد کا ترجمان ہے۔

لیکن اسلام........اجتماعی میدان میں کسی بشر کی فکر و نظر کا ترجمان بن کر نہیں آیا۔ بلکہ وہ ایک دین کی حیثیت رکھتا ہے جس کی بنیادیں وحی الٰہی اور ربط سماوی پر قائم ہیں۔ اس کی تشکیل میں کسی انسان کا عملی یا اجتماعی تجربہ شامل نہیں ہے اور نہ اس میں تاریخ کے حالات سے مدد لی گئی ہے۔

آج کی دنیا ان چار نظاموں میں سے دو پر تقسیم ہوگئی ہے........ایک بلاک سرمایہ دارانہ نظام کا پرستار ہے اور اسی کو انسانیت کے لئے صالح و سودمند سمجھتا ہے اور دوسرا

بلاک اشتراکیت کا دلدادہ ہے، ہر ایک کی ایک سیاست ہے جس کی بنیاد پر اپنے نظام کی حمایت وحفاظت کرتا ہے اور ہر ایک کے ذہن میں ایک اسکیم ہے کہ اپنے بے پناہ اسلحوں کی بنا پر سارے عالم کو اپنے نظام کی گرفت میں لے لے۔

اشتمالیت اور اسلام کا وجود فی الحال انسانی فکر کا رہین منت ہے۔ اور دنیا کے کسی خطے میں ان کا وجود نہیں پایا جاتا۔ یہ اور بات ہے کہ اسلام تاریخ کے ایک دور میں تجربہ کی منزل میں آچکا ہے جب اس نے اجتماعی تنظیم کے میدان میں اپنی بے پناہ صلاحیتوں کا اظہار کیا تھا۔ لیکن اس کے بعد کچھ طوفان اٹھے، کچھ آندھیاں آئیں، اسلام اپنی صحیح رہنمائی سے محروم ہوا۔ ناپختہ ذہنوں نے حکومت کی باگ ڈور سنبھالی، مذہب کی روح افراد سے جدا ہوئی اور اسلامی نظام کا خیمہ ڈیرا اجڑ گیا........اب اسلام رہ گیا اور انسانی ذہن......... نظام رہ گیا اور بشری قلب و دماغ.........کچھ مخلص پرستار بھی رہ گئے ہیں جن کے دلوں میں اس کے رواج کی تڑپ تاہنوز باقی ہے۔[۱]

لیکن اشتمالیت کو یہ شرف بھی حال نہ ہو سکا اور اشتراکیت ابھی اس کے لئے زمین ہموار کرنے میں لگی ہے.........نظا اشتراکیت کا حقیقی مقصد اشتمالیت ہی تھا لیکن جب سماج اسے برداشت نہ کر سکا تو ارباب حل وعقد نے اشتراکیت کو ابتدائی قدم کے طور پر رائج کر دیا اور ابھی یہ ابتدائی قدم باقی ہے........

ہمارا فرض ہے کہ ہم ہر نظام کے بنیادی اصول وقواعد کا جائزہ لے کر یہ واضح کریں کہ ہمارا موقف کیا ہونا چاہئے اور ہمارے سفینۂ اجتماع کو کس ساحل سے لگنا چاہئے۔؟

---

[۱] یہی تڑپ تھی جس نے آیت اللہ الخمینی دام ظلہ کے زیر سایہ ایران میں اسلامی انقلاب برپا کیا اور یہی جذبہ تھا جس کے زیر اثر عراق میں اسلامی اقتدار قائم کرنے کی فکر مصنف محترم کے ذہن میں تھی اور جس کے نتیجہ میں سرکار محترم کو جام شہادت نوش کرنا پڑا۔ آپ کی شہادت نے مسلمان خون میں حرارت پیدا کر دی ہے اور عالم اسلام کو ہوشیار کر دیا ہے کہ دنیا اسلام کے مخلص پرستاروں سے خالی نہیں ہے۔ اسلام قربانی چاہتا ہے مشرق ومغرب کی غلامی نہیں۔

”سرمایہ دارنہ ڈیموکریسی“

سرمایہ دارڈیموکریسی اس نظام کا نام ہے جس نے اقتصادی میدان میں ایک قسم کے ظلم کو عام کیا ہے تو سیاسی میدان میں ڈکٹیٹرشپ کو فکر ونظر کی منزل میں کنیسہ کا خاتمہ کیا ہے تو سماج کی باگ ڈور ایک ایسی جماعت کے حوالے کردی ہے جس نے پہلے والوں کے کرتوت نئی شکل میں پیش کرنے کو شعار بنایا ہے۔

اس نظام کی بنیاد اس بات پر ہے کہ فرد کو مکمل آزادی دے کر اس کے مصالح کا تحفظ کیا جائے۔ اس لئے کہ فرد کے مصالح ہی فطری طور پر ایک سماج کی مصلحت کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔ حکومت کا فرض ہے کہ وہ افراد کے مصالح کا لحاظ رکھے تا کہ اس طرح معاشرہ خودبخو در و بہ ترقی ہوجائے۔

اس نظام میں چار قسم کی آزادی پائی جاتی ہے۔

سیاسی، اقتصادی، فکری، شخصی

سیاسی آزادی کا مطلب یہ ہے کہ ہر شخص عمومی زندگی اور سماجی بہبود کے منصوبوں میں رائے دینے کا حق رکھتا ہے حکومتیں عوام کی رائے سے قائم نہ ہوں گی اور ہر شخص کی رائے کا برابر سے احترام کیا جائے گا۔ حکومت انہی عوام کی فلاح و بہبود کے لئے قائم کی جاتی ہے۔ اس کے قیام میں ان سے رائے لینا اور پھر ان کی رائے کا احترام کرنا ایک بنیادی فرض ہے جسے نظر انداز کرنا ناانصافی اور ظلم ہے۔ وہ اپنی مصلحت کو بہتر سمجھتے ہیں اور اسی سمجھ کے مطابق حکام کا انتخاب کر سکتے ہیں۔ اس مسئلہ میں کسی ایک فرد یا چند افراد کو ترجیح نہیں دی جا

سکتی یہ پورے سماج کی موت وحیات کا مسئلہ ہے۔اس میں ہر شخص کو اپنی قسمت کا فیصلہ خود کرنا ہوگا اور پھر جب اجتماعی زندگی کے نتائج واثرات میں سب برابر کے شریک ہیں تو کوئی معنی نہیں ہیں کہ اس کی تشکیل وتنظیم میں انہیں برابر سے شریک نہ کیا جائے۔۔۔اسی بنیاد پر الیکشن کا قانون نافذ ہوا اور حکومتوں کے اختیارات کو اکثریت کی رائے کا تابع بنادیا گیا۔

اقتصادی آزادی کا مطلب یہ ہے کہ معاشی میدان میں ہر شخص کو مکمل طور پر آزاد رکھا جائے،کسی پر پابندی نہ لگائی جائے،ملک کا ہر باشندہ ان اختیارات کا حامل ہو کہ وہ چیزوں کو اپنی ملکیت بنا سکے،چاہے اس کا مقصد صرف کرنا ہو یا پیداوار کو بڑھانا ہو........ وہ اسے تباہ وبرباد کردے یا بیلنس بڑھالے۔جو چیز چاہے پیدا کرے جس طرح چاہے پیدا کرے۔جس مقصد کے لئے چاہے پیدا کرے،اور جس انداز سے چاہے اپنی ثروت میں اضافہ کرے۔

اس نظریہ کے بعض پرستاروں کا یہ عقیدہ ہے کہ اقتصادی میدان کی یہ آزادی جو ایک قسم کی فطری حیثیت رکھتی ہے ایک عظیم سیاست ہے جو سماج کی اصلاح اور اقتصادی توازن کے قائم کرنے کا بہترین ذریعہ ہے۔انسان میں ذاتی فائدہ کا جذبہ ہوتا ہے جو اسے ہر تکلیف کو برداشت کرنے اور ہر عملی میدان میں نشاط ظاہر کرنے کی دعوت دیتا ہے اور یہی تحمل ونشاط ایک دن سماجی ارتقا کا پیش خیمہ بن جاتا ہے۔بازار میں پیداوار والوں اور بیوپاریوں کی آزادی سے پیدا ہونے والے مقابلے سے مختلف معاملات میں روح عدل و انصاف پیدا ہوسکتی ہے اور کوئی آدمی بھی زیادتی سے کام نہیں لے سکتا۔اقتصادیات کا فطری قانون ہے کہ جب کسی جنس کی قیمت اس کی فطری حیثیت سے زیادہ ہوجائے گی تو اس کی طلب خود بخود کم ہوجائے گی اور طلب کی کمی خود ہی ایک دن قیمت کی کمی کا سبب بن جائے گی۔ہر شخص اپنے مال کو نکالنے کے لئے قیمت کم کرے گا اور اس طرح نتیجہ میں قیمتوں میں توازن پیدا ہو جائے گا،یہی حال شخصی آزادی اور بازاری مقابلے کا ہوگا۔شخصی آزادی انسان کو آمادہ کرے گی کہ اپنے فائدے کے لئے زیادہ سے زیادہ جنس پیدا کرے۔

مصارف کم سے کم ہوں اور یہ بات ذاتی اور انفرادی ہونے کے باوجود اجتماعی مصلحت کا پیش خیمہ بن جائے گی۔

اس طرح بازار میں مقابلہ کی بنیاد پڑے گی ہر شخص اشیا کی قیمت، مزدور کی اجرت کا خاص لحاظ رکھے گا۔ ہر ایک کو قیمت کے اضافے اور مزدور کی اجرت کی کمی سے اندیشہ ہوگا اور ذاتی منافع کے زیر سایہ بھی سماجی فلاح پروان چڑھ جائے گی۔

فکری آزادی کے معنی یہ ہیں کہ لوگ اپنے عقائد ونظریات میں آزاد رہیں۔ اپنے ذہن کے مطابق سوچیں اور اپنی عقل کے مطابق فیصلہ کریں۔ حکومت کو ان کی کسی فکری خواہش یا نفسانی طلب پر پابندی لگانے کا حق نہیں ہے اور نہ وہ ان معاملات میں مداخلت کرسکتی ہے۔

شخصی آزادی کا مطلب یہ ہے کہ انسان اپنے رہن سہن کے طریقوں میں ہر قید و بند سے آزاد رہے، اپنے ارادہ کا مالک ہو، اور اپنی رغبت میں مختار......... چاہے اس سلوک سے کتنے ہی غلط اثرات کیوں نہ پیدا ہوں اور قوت ارادی کسی قدر کمزور کیوں نہ ہو جائے، شرط صرف یہ ہے کہ یہ انفرادی آزادی دوسروں کی آزادی پر اثر انداز نہ ہو اور ان کے حقوق سے مزاحمت پیدا نہ کرے........ اب ہر شخص اپنی پسند اور خواہش کے مطابق رسم ورواج، عادت وشعار کو اپنا سکتا ہے جب تک دوسروں کی رسم پر کوئی اثر نہ پڑے، اس لئے کہ یہ مسئلہ اس کی ذات سے متعلق ہے اور ذاتی مسائل میں چھیڑ چھاڑ خلاف عقل ومنطق ہے۔

دینی آزادی بھی سرمایہ دارانہ نظام میں ایک قسم کی فکری آزادی ہے اور عملی میدان میں اس کا اندراج بھی شخصی آزادی کے ضمن میں ہوجاتا ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ اس نظام میں اجتماعی مصلحت کا دارومدار انفرادی مصالح پر ہے۔ فرد ہی وہ مرکز ہے جس پر جماعت کو قائم ہونا چاہئے اور فرد ہی وہ نقطہ ہے جس سے سماج کا دائرہ تیار ہوتا ہے۔ حکومت کا کام افراد کے مصالح کا تحفظ کرنا اور ان کے فائدے کا بہتر سے بہتر انتظام کرنا ہے۔

یہ ہیں وہ سرمایہ دارانہ ڈیموکریسی کے بنیادی اصول جن کے لئے اس قدر

انقلابات عالم وجود میں آئے اور اس مقدار میں قوموں کو جدوجہد کرنا پڑی۔ ان کے نمائندوں کا دعویٰ تھا کہ جنت انہیں کے زیر قدم ہے، راحت ورفاہیت، سکون واطمینان، دولت وثروت سب انہیں کے بل بوتے پر حاصل ہوسکتی ہے۔اس نظام میں آج تک متعدد ترمیمیں ہوچکی ہیں لیکن اس کی بنیادیں بدستور باقی ہیں اوران میں کوئی تغیر نہیں ہوسکا ہے۔

سرمایہ داری کا مادی رخ

کھلی ہوئی بات ہے کہ سرمایہ دارانہ نظام ایک خالص مادی نظام ہے جس پر اول وآخر مبدومعاد کا کوئی تصور نہیں ہے اورصرف مادی فائدے پر نظر رکھی گئی ہے۔لیکن اس کا بھی کوئی مادی فلسفہ نہیں ہے اور نہ اس کے تفصیلات بیان کئے گئے ہیں۔ یہاں کی زندگی مادیت کے علاوہ ہر تعلق سے جدا ہے اور یہاں کا فلسفہ ہر فلسفہ سے ماور،ااس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ یہاں فلسفہ کا کوئی مدرسہ فکر یااس کے اعوان وانصار نہ تھے بلکہ مقصد صرف یہ ہے کہ ان کا فلسفہ بھی مادیت سے متاثر تھااور صنعتی انقلاب کے زیر اثر ہر فکر تجربہ کی فریفتہ ہو چکی تھی۔سابق عقائد مشکوک نگاہوں سے دیکھے جانے لگے تھے اور حقائق پر شبہات ظاہر کئے جارہے تھے دین کے خلاف سرکشی ہورہی تھی اور افکار جامد ہورہی تھیں۔ظلم وجور کی خوشامد ہورہی تھی اور ہر معرکہ میں اجتماعی فساد کو فتح نصیب ہورہی تھی۔

اس ساری مادیت پرستی کا راز یہ تھا کہ صنعتی انقلاب کے بعد سے تجربہ نے نئی نئی ایجادات اور تازہ ترین انکشافات کی بنیاد پر اس قدر اہمیت حاصل کر لی تھی کہ اس دور کا انسان تجربہ کے علاوہ کسی طاقت پر ایمان لانے کے لئے تیار نہ تھا۔اس کی نظر میں ہر علم و معرفت کی بنیاد اور ہر فیصلہ کی صحت وسلامتی کی اصل یہی تجربہ تھا۔۔۔نتیجہ یہ ہوا کہ علمی اور صنعتی میدان سے آگے بڑھ کر تجربہ کے فلسفہ وفکر کے میدان میں بھی قدم رکھا اور وہاں بھی بنیادی حیثیت کا حامل ہوگیا.........حالانکہ ہم اپنی کتاب ''ہمارا فلسفہ'' میں ثابت کر چکے ہیں کہ تجربہ کی صحت کی بنیاد بھی عقلی اور فکری اصولوں پر بنی ہے۔تجربہ بذات خود کوئی علمی قیمت نہیں رکھتا۔علوم ومعارف کی بنیاد عقل پر ہے جو محسوسات سے بالاتر ہو کر سوچنے کی

صلاحیت رکھتی ہے۔

حقائق میں شک وشبہ کا سبب یہ تھا کہ اس دور میں کچھ باتیں انتہائی بدیہی اور واضح حقیقت کی حیثیت اختیار کر چکی تھیں۔ زمین پورے عالم کا مرکز تسلیم کی جا چکی تھی، انقلاب نے تجربات سے اسے غلط ثابت کر دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ سارے حقائق ایک نظر سے دیکھے جانے لگے اور شک وشبہ کا سیلاب کتنے ہی عقائد وافکار کو اپنے ساتھ بہا لے گیا اور یونانی سفسطہ از سر نو میدان حقیقت پر قابض ہو گیا۔

مذہب سے بغاوت و بیزاری کا راز یہ تھا کہ گرجا نے دین کے نام پر اس قدر فسادات برپا کئے تھے اور اسے اپنے اغراض وخواہشات کی تکمیل کا یوں ذریعہ بنالیا تھا کہ ہر شخص دین سے بیزار ہونے لگا۔ اب ہر جرم دین کے نام پر ہوتا تھا اور ہر برائی کے لئے دین کا بہانہ ڈھونڈا جانے لگا تھا۔۔۔ نتیجہ میں بغاوت لازمی تھی۔ جس کا ظہور ہوا۔ حالانکہ اگر اہل کنیسہ کی یہ حرکتیں نہ ہوتیں تو اس قسم کی کوئی بغاوت سر نہیں اٹھا سکتی تھی۔

تجربات کا بڑھتا ہوا اعتبار، مسلمات کے خلاف انکشاف اور گرجا کے مظالم یہی تینوں عناصر تھے جن کی بنیاد پر مغرب میں مادیت کو اوج وعروج حاصل ہوا......لیکن اس کے بعد بھی سرمایہ داری کا کوئی مادی فلسفہ نہ تھا جو اس کی عاجزی اور اس کے کھوکھلے پن کا زندہ ثبوت تھا اس لئے کہ کوئی بھی تنظیم اس وقت تک کارگر نہیں ہو سکتی جب تک اس کی پشت پر کوئی بنیادی فلسفہ نہ ہو اور کوئی بھی ضابطہ اس وقت تک مفید نہیں ہو سکتا جب تک اس کا مرکزی نقطہ نہ معین ہو........ یہ عجیب وغریب تضاد ہے کہ حیات کے مسائل پر الگ بحث کی جائے اور اجتماعی تنظیم کے لئے علیحدہ سے فکر کی جائے جبکہ تنظیم کا مطلب ہی حیات کو منظم کرنا اور نظام کا مقصد اولین حیات کی ترتیب وتہذیب ہے۔ حیات اگر کسی قوت غیبی اور طاقت خلاق کی صنعت وایجاد ہے تو اس کے تمام اطوار وحالات، جملہ آداب وکیفیات اسی کے اشارے کے مطابق ہوں گے وہ اس کے تقاضوں سے زیادہ باخبر اور اس کے مسائل سے زیادہ واقف کار ہو گی۔ اور اگر از خود موجود شدہ ہو گی تو اس کی تنظیم ذاتی اور خود رائے

ہوگی اور اس کی کوئی بنیاد نہ ہوگی۔ اسی طرح اگر حیات دنیا کسی حیات لامحدود کا نتیجہ ہوگی تو اس حیات کے قوانین اسی حیات سے حاصل کئے جائیں گے اور اگر اتفاقیہ موجود ہوگی تو اس کے قوانین کی کوئی ابتدائی منزل نہ ہوگی۔ جس سے معلوم ہوتا ہے ایمان باللہ کا مسئلہ خالص فکری اور عقلی مسئلہ نہیں ہے جسے حیات وکائنات کے مسائل سے الگ کیا جا سکے بلکہ ایک ایسا مسئلہ ہے جو عقل وقلب وحیات تینوں سے بیک وقت مربوط ہے۔ عقل اس کا اعتراف کرتی ہے۔ قلب اطمینان پیدا کرتا ہے اور حیات اسی کے سانچے میں ڈھل جاتی ہے۔

ایمان کے زندگی سے مربوط ہونے کی ایک دلیل خود سرمایہ دارانہ نظام بھی ہے، اس لئے کہ اس نظام کی بنیاد صرف اس بات پر ہے کہ عالم وجود میں کوئی ایک ایسا فرد یا چند افراد کی کوئی ایک ایسی جماعت نہیں ہے جس کی طرف تنظیم حیات کے مسئلہ کو موڑا جا سکے اور جس کے اشارے پر پوری زندگی کو رقصاں کیا جا سکے، اور یہ ایک ایسی مادیت ہے جس کا مطلب کائنات کے از خود وجود کے علاوہ کچھ نہیں ہے تو اگر سرمایہ داری مادیت کی ممنون کرم ہوسکتی ہے تو دوسرا نظام مادیت کا مخالف بھی ہوسکتا ہے اور نتیجہ میں دونوں ہی عقائد وافکار کے نتائج ہوں گے یہ اور بات ہے کہ سرمایہ داری اس رابطہ کے اعلان کی جرات نہیں رکھتی وہ اپنے کو مادیت کا نتیجہ نہیں کہلانا چاہتی یا اسے اس فطری رابطہ کی اطلاع بھی نہیں ہے اور وہ یہ نہیں جانتی کہ زندگی کا کوئی مسئلہ عقیدہ فکر کی دنیا سے الگ نہیں ہوسکتا اور حیات کی کوئی تنظیم حیات کے بارے میں رائے قائم کئے بغیر ناممکن ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ سرمایہ داری ایک مادی نظام ہے لیکن بلا فلسفہ ایک خود رائے تنظیم ہے لیکن بلا فکر وشعور۔

سرمایہ داری اور اخلاق

سرمایہ داری کی اسی مادیت پرستی کا نتیجہ تھا کہ اخلاقیات اس کے نظام سے الگ کر دیئے گئے اور دوسرے لفظوں میں اخلاقی قدریں بالکل بدل گئیں۔ ان کے مفاہیم میں تغیر وتبدل پیدا ہو گیا، انفرادی فائدہ اعلیٰ مقصد بن گیا، ہر آزادی اس مقصد کے حصول کے لئے مباح ہو گئی اور انجام کار میں وہ تمام مصائب وآلام، شدائد ومحن منظر عام پر آ گئے جن کے اثر سے ایک عالم چیخ اٹھا اور فضا اس کی فریاد سے گونجنے لگی۔

سرمایہ دار ڈیموکریسی کے بعض حمایت کار یہ کہنے کے عادی ہو گئے ہیں کہ شخصی مقصد ہی اجتماعی مصلحت کی ایجاد کا بہترین ذریعہ ہے، دور کہن میں جو کام اخلاق سے لیا جاتا تھا آج وہ کام شخصی منفعت سے بآسانی لیا جا سکتا ہے۔ اخلاق کو درمیان میں لانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ انسان جب کوئی اجتماعی خدمت انجام دیتا ہے تو وہ اپنا فائدہ بھی حاصل کرتا ہے اور اپنی خدمت بھی انجام دیتا ہے اس لئے کہ وہ بھی اسی اجتماع کا ایک جز اور اسی سماج کا ایک فرد ہے۔ ایک انسان جب کسی شخص کو خطرے سے نجات دلاتا ہے تو وہ اجتماعی مفاد کے ساتھ ساتھ ذاتی فائدہ بھی اٹھاتا ہے کہ ایک وقت میں یہ شخص اجتماعی خدمت کرے گا تو اس کا فائدہ نجات دلانے والے کو بھی پہنچے گا۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ شخصی فائدہ کا تصور اور ذاتی مصالح کا تحفظ ہی انسان کو اجتماعی خدمتوں پر آمادہ کرتا رہے گا اور نہ کسی اخلاقی قانون کی ضرورت پڑے گی نہ تہذیبی اقدار کی۔

میرا خیال یہ ہے کہ اس تصور کو ذہنوں کی وسعت میں جگہ دی جائے تو زیادہ بہتر

ہے اس لئے کہ عالم وجود میں ایسی کسی چیز کا پیدا ہو جانا تقریباً ناممکن ہے۔ آپ خود خیال کریں کہ اگر کسی نظام کی بنیاد شخصی منفعت اور ذاتی مصلحت پر ہو جائے اور حکومت کا فرض بھی اسی مصلحت ومنفعت کا تحفظ ہو جائے تو اس کے لغت میں اجتماعی خدمت کا نام کہاں ہوگا؟ اور صرف ایک فرد ہونے کی حیثیت سے اجتماعی فائدہ کے پلٹنے کا تصور کہاں تک عمل پر آمادہ کر سکے گا؟ جبکہ بہت سے اجتماعی اعمال ایسے ہیں جن میں انفرادی طور پر کوئی فائدہ نہیں ہے یا اگر ہے تو وہ ان زحمتوں مشقتوں کے مقابلہ میں انتہائی کم ہے جو اس خدمت پر صرف ہوتی ہیں یا ان نقصانات کے مقابلہ میں انتہائی ذلیل ہے جو وقتی طور پر اس خدمت کے سلسلے میں پیش آتے ہیں۔

سرمایہ داری کے مظالم

ظاہر ہے کہ اگر ہم سرمایہ داری جیسے بے بنیاد نظام کے مظالم وعیوب کو سلسلہ وار بالتفصیل بیان کرنا شروع کر دیں تو کتاب ختم ہو جائے اور عیوب کا سلسلہ تمام نہ ہو، اس لئے صرف ایک اشارے پر اکتفا کر رہے ہیں۔ ارباب نظر تفصیلات خود سمجھ لیں گے۔

سرمایہ داری کا پہلا ظلم اکثریت کو اقلیت پر حاکم بنا دینا اور انہیں غریبوں کے مقدر سے کھیلنے کا موقع دینا ہے۔ سیاسی آزادی نے یہ بنیاد قائم کی کہ ہر شخص رائے دینے کا حق رکھتا ہے لیکن فیصلہ اکثریت کی رائے پر ہوگا اور فرض یہ ہے کہ وہ اکثریت بھی سرمایہ دار فلسفہ کی حامل اور اسی پر ایمان لائے ہوئے ہے جہاں شخصی فائدہ سب کچھ ہے، اخلاق کچھ نہیں ہے تو آپ خود فیصلہ کریں کہ اقلیت کا انجام کیا ہوگا؟ اور اس کی زندگی کیونکر گزرے گی؟ کیا اب کوئی تعجب رہ جائے گا اگر اکثریت اپنے فائدے کے مطابق قانون بنادے اور اقلیت کے فائدے کو یکسر نظر انداز کر دے، اپنے مصالح کا اس حد تک تحفظ کرے کہ اقلیت کے مصالح پامال وپسپا ہو جائیں؟ کیا اب بھی کوئی اقلیت کے حقوق کا محافظ پیدا ہوگا اور کیا اب بھی غیر اخلاقی نظام شخصی منفعت ومصلحت سے دست بردار ہو سکے گا؟ ظاہر ہے کہ ایسا ہرگز نہ ہوگا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ سماج میں ایک طبقہ ہمیشہ پست وذلیل رہے گا اور اس کی وہی حیثیت

رہے گی جو سابق زمانے میں رہ چکی ہے فرق یہ ہے کہ پہلے ایک شخص پوری امت کو پامال کیا کرتا تھا اور اب اکثریت اقلیت کو پامال کر رہی ہے جبکہ اقلیت خود بھی افراد کے ایک بڑے مجموعہ کا نام ہے۔

اس کے بعد بھی اگر بات اسی حد تک رہ جاتی تو شاید مصائب کچھ کم ہوتے اور آنسوؤں کے درمیان مسکراہٹوں کے امکانات باقی رہ جاتے لیکن افسوس کہ ایسا نہ ہوا بلکہ سیاسی آزادی کے پہلو بہ پہلو اقتصادی آزادی کا اعلان بھی ہو گیا، جس کا مطلب یہ تھا کہ ہر شخص ہر قسم کی آمدنی، ایجاد، پیداوار، تجارت کی مکمل آزادی رکھتا ہے حکومت کا فرض ان کی آزادی کا تحفظ کرنا ہے اسے مداخلت کرنے کا کوئی حق نہیں ہے اور یہ اعلان بھی اس وقت ہوا جب صنعتی انقلاب سر اٹھا رہا تھا نئے نئے آلات ایجاد ہو رہے تھے دستکاری کا جنازہ تیار ہو چکا تھا گھریلو صنعت کے کارخانے بند ہو رہے تھے۔ اب کیا تھا قوم کے صاحبان اقتدار نے جدید آلات پر قبضہ کیا، نئی نئی پیداوار بازار میں لے آئے اور ایک بڑی تعداد اپنے وسیلہ رزق سے محروم ہو گئی۔ میدان میں صرف گنے چنے افراد دکھائی دینے لگے۔ اکثریت انہیں چند افراد کی دست نگر اور انہیں کے رحم وکرم کی طلبگار ہو گئی۔ یہ چاہیں تو قوم زندہ رہے نہ چاہیں تو موت کے گھاٹ اتر جائے اور یہ افراد بھی وہ جن کا فلسفہ مادی تھا جس میں اخلاقیات کا گزر اور معنویات کا تذکرہ نہ تھا۔

ظاہر ہے کہ نتیجہ میں وہی کچھ ہوا جو ہونا چاہئے تھا۔ ملک مادیت کی نذر ہو گیا اور سماج اونچ نیچ کے دو طبقوں پر تقسیم ہو گیا۔ یہی نہیں بلکہ اونچے طبقے کے لوگوں نے غریب اکثریت کو اور بھی پامال کیا ان کے فقر و فاقے سے ناجائز فائدہ اٹھاتے ہوئے ان سے زیادہ سے زیادہ کام لیا اور انہیں اتنی کم اجرت دی کہ وہ صرف زندہ رہ سکیں اور عام زندگی میں ان کے غلام و محتاج ہی بنے رہیں۔۔۔ یہ سب کیوں ہوا؟ اس لئے کہ نظام میں اخلاق کی کوئی جگہ نہ تھی ہر ایک اپنی آزادی سے فائدہ اٹھا رہا تھا اور اپنی مصلحت کے لئے کام کر رہا تھا۔

ستم بالائے ستم تو یہ ہے کہ قانون کی دفعات میں حق مساوات پھر بھی لکھا رہا اور

سیاسی طور پر ہر ملکی کو برابر ہی سمجھا جاتا رہا۔عوام سے یہی کہا گیا کہ تمہیں ووٹ دینے کا اتنا ہی حق ہے جتنا ایک بڑے سرمایہ دار کو ہے اور یہ نہ دیکھا گیا کہ سماج کے دوحصوں پر بٹ جانے کے بعد اور سرمایہ دار طبقہ کی عوامی قسمت کے مالک ہو جانے کے بعد اب عوامی آزادی یا برابری کا کیا سوال پیدا ہوتا ہے۔اب تو پروپیگنڈے کے سارے وسائل ووٹ خریدنے کے جملہ اسباب صرف ایک طبقہ کے ہاتھ میں ہیں۔غریب عوام کا فرض صرف یہ ہے کہ اپنی نوکری کو برقرار رکھنے کے لئے مالک کے اشاروں پر چلیں اور اسی کے نمائندے کو منتخب کریں ورنہ فاقہ کر کے دنیا سے گزر جائیں گے۔

نتیجہ یہ ہوا کہ سرمایہ دار ڈیموکریسی جمہوریت سے نکل کر ایک ایسی آمریت کی شکل میں آگئی جہاں عوام کی قسمت اور ملک کی باگ ڈور صرف چند آدمیوں کے ہاتھ میں رہ گئی اور اکثریت پامال ہونے لگی۔۔۔ جو ایک اعتبار سے قہری نتیجہ تھا۔اس مادی فلسفہ کا جس کی بنیاد پر یہ نظام قائم ہوا تھا۔

مصائب کا یہ سلسلہ یہیں پر ختم نہیں ہوا بلکہ اس کے بعد ایک اور عظیم حادثہ سامنے آیا اور وہ یہ کہ اس صاحب ثروت و اقتدار طبقہ نے ملک سے باہر سر نکالا اور آس پاس کے ملکوں پر قبضہ کرنا شروع کر دیا جس کے اسباب دو تھے:

﴿۱﴾ پیداوار کی فراوانی اس بات پر مجبور کر رہی تھی کہ خام مادہ زیادہ سے زیادہ فراہم کیا جائے اور مقابلہ کے میدان میں قدم ہمیشہ آگے رہیں۔اور ملک اس ضرورت کو پورا کرنے سے قاصر تھا۔قدرت نے اس مادہ کو پوری دنیا میں منتشر کر دیا تھا۔اب ضرورت تھی کہ ان ممالک پر بھی قبضہ کیا جائے جہاں سے یہ مواد بآسانی مل سکتے ہوں اور پیداوار میں باسہولت اضافہ کیا جا سکتا ہو۔

﴿۲﴾ نفع کی لالچ میں پیداوار کی تیز رفتاری اور عوام کے حالات میں روز افزوں پستی انہیں اس بات پر مجبور کر رہی تھی کہ وہ اپنے ملک کی پیداوار کو نہ صرف کرسکیں، خریداری کی صلاحیت تقریباً مردہ ہو چکی تھی اور سرمایہ دار اپنے مال کو سپلائی کرنے پر مجبور

تھا۔ نتیجہ کے طور پر اس نے باہر کا رخ کیا اور نئے بازار قائم کرنے کی فکر میں مشغول ہو گیا۔ اخلاقیات و روحانیت کے افکار نے سہارا دیا اور حرص و ہوس کے جذبے کی تکمیل کے لئے ہر امکانی کوشش ہونے لگی۔ غیر ملکوں پر قبضہ مباح ہو گیا۔ دوسروں کی ہتک حرمت جائز ہو گئی۔ ان کے طبیعی مراکز پر قبضہ حق سمجھا جانے لگا اور متعدد ممالک شخصی مصلحت و منفعت کی بھینٹ چڑھ گئے۔ مادیت نے اور بھی زور کیا، جنگ و جدل، قید و بند، استعمار و استحصال کوئی ذریعہ ایسا نہ تھا جسے خواہشات کی تکمیل اور تمناؤں کی برآری کے لئے اختیار نہ کیا گیا ہو۔

اب آپ ہی انصاف کریں کہ ایک خالص مادی نظام کا انجام اس کے سوا اور کیا ہوسکتا تھا اور اخلاق و روحانیت کے منکر مذہب سے اور کیا توقع کی جا سکتی تھی؟

اشتراکیت و اشتمالیت

اشتراکیت میں یوں تو بہت سے مذاہب پائے جاتے ہیں لیکن مشہور ترین مذہب مارکس کا ہے جس کی بنیاد تاریخی مادیت اور مادی جدلیت پر ہے۔ مادی جدلیت کا مفہوم یہ ہے کہ تاریخ کے ارتقا اور حیات کی نشو و نما کی تفسیر جدلیاتی نظام سے کی جائے اور دنیا کے ہر دور حیات کو دو ظاہر و باطن طاقتوں کے ٹکراؤ کا نتیجہ قرار دیا جائے، مارکس ازم میں جدلیت اس قدر مقبول اور ٹھوس حقیقت بن گئی ہے کہ اسے تاریخ، سماج، اقتصاد سب ہی پر منطبق کر دیا گیا ہے اور یہ نظریہ کائنات کی تفسیر میں فلسفہ و معاشیات کے میدان میں نظام اور سیاست کی منزل میں ایک نشان راہ بن گیا ہے انسان فکر و نظر کے اعتبار سے ایک مخصوص سانچے میں ڈھل گیا ہے اور کائنات صرف طاقتوں کا تصادم رہ گئی ہے اور بس۔

ظاہر ہے کہ مادیت یا جدلیت کوئی مارکس کی ایجاد نہیں ہے بلکہ مادیت مارکس سے ہزارہا سال پہلے سے فلسفہ کے میدان میں کارفرما رہی ہے۔ کبھی کھل کر اور کبھی پوشیدہ طور پر........ اور جدلیت انسانی فکر میں ایک مبہم خاکے کی حیثیت سے وجود پذیر رہی ہے، یہاں تک کہ ہیگل کا دور آیا اور اس نے اس کا پورا نظام مرتب کر دیا........ مارکس کا کام صرف یہ تھا کہ اس نے اس جدلیت کو زندگی کے ہر شعبہ پر حاوی کر دیا اور کائنات کے

ہر میدان میں جگہ دلوادی۔ مارکس کی تحقیقات کا خلاصہ یہ ہے:

﴿۱﴾ مارکس نے پوری تاریخ کو مادیت کا جامہ پہنا کر اس کے ہر انقلاب کو جدلیت کے سانچے میں ڈھال دیا۔

﴿۲﴾ مارکس کا خیال یہ ہے کہ تاریخ کے ہر موڑ پر سرمایہ اور زائد قیمت میں ٹکراؤ ہوتا رہا ہے جسے سرمایہ دار مزدور کی محنت میں سے چرالیا کرتا تھا۔

انہیں دونوں بنیادوں پر مارکس نے یہ طے کر دیا کہ سرمایہ دار معاشرہ کو عالم وجود سے فنا ہونا چاہئے اور ایک ایسا اشتراکی واشتمالی سماج پیدا ہونا چاہئے جہاں سرمایہ ومزدور کا جھگڑا ہی ختم ہو جائے۔ نہ سرمایہ دار مزدور کے ثمرۂ محنت سے چوری کرے اور نہ مزدور اس کے خلاف بغاوت کرے۔

معاشرہ مارکس کی نظر میں ایک میدان جنگ ہے جہاں دو طاقتیں مصروفِ کارزار رہتی ہیں۔ معاشرہ کا ہر مظہر اور یہاں کی ہر حالت مادی تقاضوں کا نتیجہ اور خالص مادی ہوتی ہے لیکن اس کے باوجود اپنے اندر اپنے مخالف عناصر بھی رکھتی ہے جن کی وجہ سے معاشرہ کے اندر ایک داخلی جنگ جاری رہتی رہے۔ اور اس جنگ کے دوران مخالف طاقتیں برسرِ اقتدار طاقتوں کو کمزور بناتی رہتی ہیں۔ یہاں تک کہ مخالف طاقتوں کا زور بڑھ جاتا ہے اور برسر اقتدار طاقتیں خود بخود میدان سے ہٹ جاتی ہیں۔ جس کا نام انقلاب رکھا جاتا ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ایک ایسا معاشرہ ایجاد کیا جائے جہاں یہ جھگڑے نہ ہوں۔ سارا سماج ایک طبقہ پر مشتمل ہو اور ہر شخص اسی طبقہ کی فلاح وبہبود کے بارے میں غور وفکر کرے۔ اتحاد عام اور سلامتی ہمہ گیر ہو...... سرمایہ داری کے مفاسد کا خاتمہ ہو اور طبقاتی نظام کا جنازہ نکل جائے۔

ظاہر ہے کہ طبقاتی نظام کا جھگڑا مالک ومزدور کی بنیاد پر پیدا ہوا تھا اس لئے ہمارا پہلا قدم یہ ہونا چاہئے کہ سماج سے مالک ومزدور کی تقسیم کا خاتمہ کریں اور یہ خاتمہ اس وقت

تک ناممکن ہے جب تک ملکیت کا تصور باقی ہے، ہر شخص کسی چیز کو اپنی ملکیت سمجھتا ہے او اسے اپنے سے زیادہ مربوط خیال کرتا ہے۔

یہاں تک آنے کے بعد اشتراکیت اور اشتمالیت کی راہیں الگ الگ ہو جاتی ہیں اور دونوں کے درمیان چند حد فاصل پیدا ہو جاتے ہیں۔

﴿۱﴾ اشتمالیت کی بنیاد یہ ہے کہ ملکیت کا یکسر خاتمہ کر دیا جائے۔کوئی شخص کسی چھوٹی بڑی چیز کا مالک نہ تصور کیا جائے۔ساری دولت حکومت کے حوالے ہو اور وہ سماج کی وکیل بن کر اس کا انتظام کرے اور اس کے اضافہ کی فکر کرے۔اس لئے کہ انفرادی ملکیت کا تصور سرمایہ دارانہ نظام پیدا کرتا ہے جو سماج کو دو حصوں میں تقسیم کر کے اسے ایک میدان جنگ بنا دیتا ہے ضرورت اس بات کی ہے کہ کسی شخص کو سرمایہ بڑھانے کی مہلت نہ دی جائے کہ وہ مزدوروں کا خون چوس سکے اور سماج کو اپنا غلام بنا کر رکھ سکے۔

﴿۲﴾ اشتمالیت کا ایک قانون یہ ہے کہ حکومت پورے سرمائے کو لوگوں کی ضروریات کے مطابق تقسیم کرے۔''ہر شخص سے بقدر ہمت وطاقت کام لیا جائے اور ہر شخص کو بقدر ضرورت مال دیا جائے''اس لئے کہ فطری طور پر ہر شخص کچھ ضروریات رکھتا ہے جنہیں پورا کرنے کے لئے اسباب کی ضرورت ہوتی ہے اور جب یہ اسباب حکومت کے ہاتھوں میں رہیں گے تو ہر شخص اس بنیاد پر محنت کرے گا کہ اس طرح حکومت کے سرمائے میں اضافہ ہوگا اور وہ اضافہ پلٹ کر میری طرف آئے گا۔

﴿۳﴾ حکومت کو چاہئے کہ معاشیات کے لئے ایک ایسا دستور مرتب کرے جس میں اس بات پر خاص توجہ دی گئی ہو کہ ملک کی پیداوار کیا، کتنی اور کیسی ہے اور پھر سماج کے ضروریات کیا ہیں؟ تاکہ دونوں کے درمیان ہم آہنگی پیدا کی جائے اور معاشرہ میں وہ امراض نہ پیدا ہو سکیں جو سرمایہ داری کے دور میں پیدا ہو گئے تھے۔جب ہر شخص آزاد تھا اور ہر ایک کا مقصد عمل اپنا فائدہ تھا اور بس۔

اشتمالیت سے انحراف

اشتمالیت کے وہ رہنما جنہوں نے اس نظام کا اعلان کیا تھا جب یہ دیکھ چکے کہ ایسا کوئی نظام اس دنیا میں قابل عمل نہیں ہے اور نہ معاشرہ اسے برداشت کرسکتا ہے۔ابھی انسان کو بدلنے کی ضرورت ہے۔اس کے اغراض جذبات،خواہشات پر پابندی لگانے کی ضرورت ہے اسے گویا ازسرنو پیدا کرنے کی ضرورت ہے جہاں ذاتی منفعت کا تصور ختم ہو جائے اور صرف اجتماعی فائدہ کا تصور باقی رہے۔انسان جو کچھ سوچے وہ اجتماعی مفاد کے لئے اور جو قدم اٹھائے وہ سماجی مصلحت کے واسطے۔یہی مجبوری تھی جس نے اشتمالیت کے بجائے اشتراکیت کو میدان میں جگہ دلائی جس کا کام اس ماحول کا تیار کرنا اور ان حالات کا سازگار بنانا تھا جن میں اشتمالیت اپنا فریضہ انجام دے سکے اور دنیا اجتماعی زندگی بسر کر سکے۔اسی لئے اس میں اشتمالیت کے ہر قانون کی ابتدائی شکل پائی جاتی ہے وہاں شخصی ملکیت کے یکسر خاتمہ کا تصور ہے۔ یہاں افراد کو بڑی بڑی صنعتوں، خارجی تجارتوں اور داخلی بڑے کاروبار سے روکا گیا ہے اور چھوٹے چھوٹے کاروبار کی اجازت دے دی گئی ہے۔اس لئے کہ وہ نظام انسان کی فطرت سے متصادم ہو گیا تھا اور انسان اسے قبول کرنے کے لئے تیار نہ تھا۔لوگ کام میں سستی کرنے لگے تھے اور ہر ایک ذہن میں یہی ایک خیال تھا کہ نتیجہ بہرحال برابر کا ملنا ہے چاہے محنت کتنی زیادہ کیوں نہ کی جائے۔اس لئے صرف دوسروں کی راحت کے لئے اپنی جان دینے سے کیا فائدہ ہے؟ اور یہ بات کسی حد تک صحیح بھی تھی۔اس لئے کہ وہ لوگ ایک ایسے معاشرے میں زندگی بسر کر رہے تھے جو خالص مادی تھی اور جس میں اخلاقی اقدار کا کوئی وجود نہ تھا اور ظاہر ہے کہ مادیت خودغرضی پر آمادہ کرتی ہے،اسے سماج کی خدمت سے کیا تعلق ہے؟

یہی وہ حالات تھے جنہوں نے دوسری بنیادیں بھی کم کرائیں اور نشاط عمل کے باقی رکھنے کے لئے مزدوروں کی اجرتوں میں فرق پیدا کیا گیا اور اس کی توجیہ یہ کی گئی کہ یہ تفرقہ کسی طبقاتی نظام کے اعتراف کے لئے نہیں ہے بلکہ ایک تمہیدی قدم ہے۔اس ماحول کو

سازگار بنانے کے لئے جس میں غیر طبقاتی نظام رائج کیا جا سکے اور یہی وجہ ہے کہ اس کے قوانین میں روزانہ تغیرات ہوتے چلے جارہے ہیں تاکہ رفتہ رفتہ ذہنوں کو ہموار کیا جا سکے یہ اور بات ہے کہ اب تک کے طولانی عرصے میں بھی یہ مقصد پورا نہ ہو سکا اور سود کا رواج اشتراکی ممالک میں باقی ہے جو سرمایہ دارانہ نظام کے باقی رکھنے کے لئے انفرادی ملکیت سے کہیں زیادہ مفید اور اشتراکیت کے لئے نقصان دہ ہے۔

مقصد یہ نہیں ہے کہ اشتمالیت کے نمائندوں کو اپنے عقیدے سے کوئی خلوص نہیں تھا یا انہوں نے اس کی ترویج میں کوئی کوتاہی کی ہے۔ بلکہ میں تو صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ یہ بیچارے مقام عمل میں کچھ ایسے حقائق سے ٹکرا گئے ہیں جن کا مٹانا ان کے لئے ناممکن تھا۔ اس لئے انہوں نے اپنے نظام میں ترمیم ہی زیادہ مناسب خیال کی اور ترمیم کو تمہیدی اقدام کا نام دے دیا تاکہ لوگ اس مستقبل سے آس لگا سکیں جس کے لئے یہ سارے ہنگامے برپا کئے گئے ہیں۔

سیاسی اعتبار سے اشتمالیت کا عقیدہ یہ تھا کہ حکومت کا یکسر خاتمہ کر دیا جائے۔ ہر انسان فکری طور پر اجتماعی عقل کا حامل ہو۔ اس کا ذہن اجتماعی مفاد کے سانچے میں ڈھلا ہو۔ وہ جب سوچے تو اجتماعی مفاد کے لئے اور عمل کرے تو اسی کے فائدے کے لئے لیکن جب تک یہ معجزہ رونما نہ ہو اور سارا عالم ایک طبقہ میں نہ آ جائے اس وقت تک کے لئے حکومت کا وجود ضروری ہے۔ اور ضرورت اس بات کی بھی ہے کہ یہ حکومت مزدوروں کی ہو جس کا انداز مزدوروں کے حق میں جمہوری ہو اور باقی لوگوں کے حق میں آمرانہ۔۔۔ مزدور آمریت کی ضرورت اس لئے بھی ہے کہ اس طرح میدان مزدوروں ہی کے ہاتھ میں رہے گا۔ حکومت کے سارے کام انہیں کی منفعت و مصلحت کے لئے ہوں گے اور سرمایہ داری از سرنو منظر عام پر نہ آ سکے گی۔

حقیقت یہ ہے کہ اشتراکیت یا اشتمالیت کو سرمایہ داری پر ایک امتیاز ضرور حاصل ہے اور وہ یہ کہ سرمایہ داری مادی ہونے کے باوجود کوئی مادی فکر یا منظم فلسفہ نہیں رکھتی لیکن

اشتراکیت واشتمالیت کا ایک بنیادی فلسفہ ہے جس پر اس کے اصول قائم ہوئے ہیں اور جس کی بنیاد پر اس کا سارا نظام مرتب ہوا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ اس مادیت میں نہ مبدکی جگہ ہے اور معاد کی۔۔۔اخلاقیات کا کوئی درجہ ہے نہ روحانیت کا۔ضرورت اس بات کی ہے کہ اس نظام کا تجزیہ بھی فلسفہ ہی کی روشنی میں کیا جائے اور یہ دیکھا جائے کہ اشتراکیت کا نظریہ حیات وکائنات کے بارے میں کہاں تک صحیح ہے تاکہ اس کی روشنی میں مرتب ہونے والے نظام کے بارے میں بھی کوئی علمی فیصلہ کیا جاسکے۔

اشتراکیت کے بارے میں فلسفیانہ بحث سے پہلے ایک نظر میں اتنا ضرور دیکھا جاسکتا ہے کہ اشتراکیت پر مکمل طریقے سے اجتماعیت کی چھاپ ہے یہاں فرد کی کسی حیثیت کا اعتراف نہیں کیا گیا بلکہ اسے سماجی فائدے کا ایک آلہ ووسیلہ فرض کیا گیا ہے اور بس بعینہ سرمایہ دارانہ نظام کی طرح کہ وہاں اجتماع کا کوئی درجہ نہیں ہے مکمل آزادی افراد کو حاصل ہے۔سماج کو انہیں افراد کا تابع ہونا چاہئے اور انہیں کے مصالح کے لئے کام کرنا چاہئے۔ گویا اجتماع وانفراد دو عظیم طاقتیں ہیں جو ہمیشہ میدان معاشرہ میں مصروف کارزار رہتی ہیں۔سرمایہ داری کے نظام میں فتح افراد کی ہوتی ہے اور سماج کی اکثریت ذلت ورسوائی، مصیبت وزبوں حالی کی زندگی گزارتی ہے اور اشتراکی نظام میں فتح معاشرہ کی ہوتی ہے جہاں افراد اپنی فطری آزادی کھو بیٹھتے ہیں اور ان کے اختیارات سلب ہوجاتے ہیں ان کا وجود بے ارزش ہوجاتا ہے اور وہ صرف ایک آلے کی حیثیت سے رہ جاتے ہیں۔

اشتمالیت کا محاسبہ

حقیقت یہ ہے کہ اشتمالیت نے شخصی ملکیت کا خاتمہ کر کے سرمایہ داری کے بہت سے مفاسد کا قلع قمع کر دیا ہے لیکن مشکل یہ ہے کہ خود اس قانون کے اندر کچھ ایسی فطری کمزوریاں موجود ہیں جو اس علاج کو بے ارزش بنا دیتی ہیں اور نگاہ انصاف میں اس کی کوئی قدر وقیمت نہیں رہ جاتی۔

یہ ایک ایسا دشوار گزار راستہ ہے جس سے چلنے کے لئے نفس اور نفسانی تقاضوں

سے علیحدگی ضروری ہے اور یہ ایک انسان کے بس کی بات نہیں ہے۔اس علاج میں مرض کی صحیح تشخیص بھی نہیں کی گئی اس لئے مرض کا مکمل خاتمہ ناممکن ہے۔

اشتمالیت کی سب سے بڑی کمزوری یہ ہے کہ اس نے انسانی حریت وآزادی کا قلع قمع کر کے شخصی ملکیت کی جگہ اجتماعی ملکیت کو رکھنا چاہا ہے جو کم از کم موجودہ دور تک خلاف فطرت انسان ہے۔اس کے بعد انسانی فطرت میں تغیر پیدا ہو جائے تو اس کی کوئی ذمہ داری نہیں ہے۔آج تک کا انسان تو ہمیشہ ذاتی مفاد کے بارے ہی میں سوچتا ہے وہ اس کائنات کو اپنی ذات کے نقطہ نگاہ سے دیکھتا ہے اور اشتمالیت اسے ''نشاۃ ثانیہ'' دے کر اسے اجتماعی سانچے میں ڈھالنا چاہتی ہے جہاں اس کی انفرادیت کا یکسر خاتمہ ہو جائے۔ ظاہر ہے کہ ایسے ذہنی وعقلی فطری وطبیعی انقلاب کے لئے ایک ایسی قوت کی ضرورت ہے جو معاشرہ کی باگ ڈور کو اپنے آہنی ہاتھوں سے سنبھال لے جہاں ہر آواز دبائی جا سکے اور ہر سانس کو بند کر دیا جائے۔نشر واشاعت کے وسائل پر قبضہ کر لیا جائے اور انسانیت سوز سزائیں دی جائیں تا کہ انسان ایک مخصوص سانچے میں ڈھل سکے اور اس کے دل سے بغاوت کے جذبات محو ہو جائیں۔

یہ بات تنہا اشتمالیت کے لئے نہیں ہے بلکہ ہر وہ نظام جو ذہنی طور پر ماحول کے سازگار ہونے سے پہلے معاشرہ پر بار کیا جائے اس کا یہی انجام ہوگا اور اس کی اشاعت کے لئے یہی ذرائع استعمال کرنا پڑیں گے۔ہاں جب انسان کی فکر اجتماعی ہو جائے گی اس کی عقل اجتماعیت کے سانچے میں ڈھل جائے گی۔اس کے نفسانی خواہشات اور انفرادی جذبات محو ہو جائیں گے تو ایسے نظام کا قائم کرنا انتہائی آسان ہو جائے گا۔

لیکن کھلی ہوئی بات ہے کہ مادیت پرست دنیا میں ایسے انقلاب کا رونما ہونا ناممکن ہے وہاں جنت دنیا میں نہیں بنائی جا سکتی اور انسان سازی کا کارخانہ مادی سرزمین پر نہیں کھل سکتا۔

یہ اور بات ہے کہ اشتمالیت کے رہنما ہم سے اس بات کا وعدہ کرتے ہیں اور وہ

اپنے اندر ایسے انسان کے پیدا کرنے کی طاقت بھی رکھتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ اجتماعی انسان کی تخلیق اس ماحول میں بھی ممکن ہے جہاں اخلاقی اقدار کا انکار کر دیا گیا ہو اور انفرادی اغراض وجذبات کا وہاں بھی خاتمہ ہوسکتا ہے جہاں مادیت کی کارفرمائی اور دنیاوی لذت کی حکمرانی ہو۔ حالانکہ موجودہ صورت حال میں یہ بات اسی وقت ممکن ہوسکتی ہے جب ایک پوری جماعت اس نظریہ کی حمایت پر کمر بستہ ہو جائے، لوگوں پر سختی کرے، انہیں اسی نظریہ کا جبری طور پر پابند بنائے۔ ان کے خیالات میں تبدیلی پیدا کرے اور ان کے نفس سے انفرادیت کے سارے جذبات سلب کرے۔ ظاہر ہے کہ ایسے حالات میں انسان کو معاشی اعتبار سے سکون ضرور مل جائے گا اور اس کے ضروریات زندگی ضرور پورے ہو جائیں گے اس لئے کہ حکومت کے پاس ضرورت سے زیادہ سرمایہ محفوظ ہو چکا ہوگا۔ لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ انسان کی فطرت اور اس کے جذبات کا کیا حشر ہوگا۔ اس کی آزادی کس ٹھکانے لگے گی۔

کیا یہ ممکن نہیں ہے کہ ایک ایسا نظام اختیار کرلیا جائے جہاں معاشی اعتبار سے یہ ساری سہولتیں بھی فراہم ہوں اور انسان کی فطری آزادی بھی محفوظ رہے۔ اجتماعی حالات بھی سدھر جائیں اور حکومت کی بھٹی میں انفرادیت کو پگھلانا بھی نہ پڑے؟ اور سچ تو یہ ہے کہ جس نظام میں انسان کو معاشی آزادی میسر نہ ہو، غذائی صورت حال تک چند آدمیوں کے خیال سے وابستہ کردی جائے وہاں کسی دوسرے قسم کی آزادی کا کیا سوال پیدا ہوتا ہے۔؟

مارکسی ازم کے بعض پرستاروں کا کہنا ہے کہ انسان کی فطری ضرورت بہترین غذا اور عمدہ اسباب معیشت وزندگانی ہیں۔ اور جب کسی بھی نظام میں یہ باتیں میسر ہو جائیں گی تو انفرادی آزادی کی کیا ضرورت ہے اور اپنے افکار وخیالات کا اظہار ہی کیا ضروری ہے۔ کیا ہر عقیدہ کا اظہار اور ہر خیال کا اعلان بھی انسان کی کوئی فطری ضرورت ہے اور کیا بغیر تنقید واعتراض کے انسان زندہ نہیں رہ سکتا؟

بظاہر یہ بات بڑی خوبصورت ہے لیکن افسوس کہ ان لوگوں نے اپنے سامنے

صرف سرمایہ داری کا نظام رکھا ہے اور اسی پر یہ بنیاد قائم کی ہے کہ شخصی ملکیت سماج کے لئے انتہائی ضرر رساں اور نقصان دہ ہے۔اس لئے اس پر باقاعدہ پابندی عائد کر کے حکومتی پیمانہ پر عوام کے آب و دانہ کا انتظام کیا جائے۔ان لوگوں نے کسی اور نظریہ و مذہب پر نظر ہی نہیں ڈالی ورنہ یہ سوچنے کی انسانی فطرت میں کسی بھی جذبے کی قربانی اس وقت تک جائز نہیں ہے جب تک کہ اس قربانی کے بغیر سماج و معاشرہ کی اصلاح ناممکن نہ ہو جائے۔انسانیت کے سامنے دو عظیم مسائل ہیں۔ایک طرف اس کی حریت ہے جو اس کا فطری اور معنوی حق ہے اور ایک طرف مادی ضرورت ہے جو اس کا معاشی اور سماجی لازمہ ہے۔ضرورت ایک ایسے نظام کی ہے جو ان دونوں پہلوؤں کا جامع اور دونوں گوشوں پر حاوی ہو۔

انسانیت کے لئے سرمایہ داری اور اشتراکیت دونوں ایک جیسے ہیں۔سرمایہ داری میں چند لوگ عوام کی طاقت کو نچوڑ لیتے ہیں۔انہیں خوشگوار زندگی، مناسب اجرت اور پرسکون ماحول نصیب نہیں ہوتا اور اشتراکیت میں ان تہدیدی تمام باتوں کے باوجود انسان ہمہ وقت تہدیدی منزلوں پر رہتا ہے ہر عمل کا محاسبہ ہوتا ہے۔ہر وقت قید و بند، قتل و در بدری کا اندیشہ دامن گیر رہتا رہے اور زندگی ایک خوفزدہ، مرعوب، مدہوش اور پریشاں حال انسان کی زندگی بن جاتی ہے ....جبکہ ایک تیسرا نظام ایسا بھی ممکن ہے جہاں انسان معاش کے اعتبار سے مطمئن اور جذبات وعواطف کے اعتبار سے پرسکون ہو۔سوال صرف یہ ہے کہ وہ نظام کیا ہے اور یہ خواب کس طرح شرمندہ تعبیر بن سکے۔؟

ظاہر ہے کہ اشتمالیت ایسا نظام نہیں پیش کر سکتی۔اس میں سرمایہ داری کے مفاسد کا کسی حد تک علاج ضرر ہے لیکن اس کے بعد صرف جذباتی نعرے ہیں اور بس۔نہ مرض کی صحیح تشخیص ہے اور نہ علاج کا معقول انتظام، انفرادی ملکیت جسے تمام فسادات کا سرچشمہ فرض کیا گیا ہے وہ تنہا ان فسادات کی اصل نہیں ہے۔

وہ نہ جدید آلات و وسائل کی بنیاد پر لاکھوں مزدوروں کو بیکار و معطل بنا دینے کی دعوت دیتی ہے اور نہ مزدوروں کی اجرت میں کمی اور زیادتی کی خواہاں ہے۔وہ نہ کسی سے

یہ کہتی ہے کہ تم اپنی پیداوار کا ایک بڑا حصہ برباد کردو تا کہ جنس کی کمی سے مانگ بڑھ جائے اور تمہیں زیادہ سے زیادہ قیمت مل سکے اور نہ کسی دولت مند سے یہ تقاضا کرتی ہے کہ وہ اپنے مال کو سود پر اٹھا کر اسے دس گنا بنالے۔

اس کا مطلب نہ یہ ہے کہ ثروت و دولت کا مالک بازار کا تمام سامان خرید کر ذخیرہ اندوزی کرے اور نہ یہ مقصد ہے کہ نئے نئے بازار کھولنے کے لئے غیر ممالک پر ڈورے ڈالے جائیں اور ان کے سکون و اطمینان کو خطرہ میں ڈالا جائے۔

ان تمام باتوں کا سرچشمہ شخصی ملکیت نہیں ہے بلکہ وہ مادی فلسفہ ہے جس میں ہر ایک کو اپنی ہی فکر ہوتی ہے اور ہر انسان کو مکمل آزادی ہوتی ہے نہ کوئی اخلاقی نظام ہوتا ہے نہ روحانی جذبہ، ظاہر ہے کہ ایسے خودغرض اور مادیت پرست نظام کے زیر سایہ پرورش پانے والے ذہن سے ان مظالم کے علاوہ توقع ہی کیا کی جاسکتی ہے۔ یہ نظام ہی ایسا ہے جس میں ان لعنتوں اور شقاوتوں کا ہونا ضروری ہے اور یہ دستور ہی ایسا ہے جس میں انسانیت کو مظلومیت کی زندگی گزارنا پڑے گی اور جب یہ طے ہوگیا کہ فسادات کا سرچشمہ انفرادی ملکیت نہیں ہے بلکہ مادیت پرستی ہے تو یہ بھی معلوم ہوگیا کہ انسانی مسئلے کا حل انفرادی ملکیت کے قانون میں تبدیل نہیں ہے بلکہ اس کا صحیح حل یہ ہے کہ مادیت کے نظام کو بدل کر اس کی جگہ روحانیت رکھی جائے اور خودغرضی کو ایثار وقربانی اور اخلاقی اقدار سے بدل دیا جائے۔

مسئلہ کی صحیح توجیہہ

اسلام اوراجتماعی مشکل

اجتماعی مشکل کے حل کی پہلی کڑی تک پہنچنے کے لئے اس سوال کا اٹھانا ضروری ہے کہ وہ کون سے اسباب ہیں جن کی بنیاد پر سرمایہ داری نے ذاتی منفعت اور شخصی مصلحت کو معیار ومقیاس اور ہدف وغایت قرار دیا ہے۔؟

وہ کونسی فکر ہے جس کی وجہ سے معاشرہ اتنی عظیم مصیبت میں گرفتار ہو گیا ہے اور سرمایہ داری انسانی فلاح و بہبود کے میدان میں ناکام رہی ہے؟ اسی فکر کو باطل کرنے کے بعد ہم معاشرہ کی تباہی کی ہر بنیاد کو منہدم کر سکتے ہیں اور انسانیت کے خلاف ہونے والی ہر سازش کو ناکام بنا سکتے ہیں تاکہ ذاتی مصلحت انسانی مفاد کا ذریعہ بنے اور انفرادی ملکیت سے صنعتی پیداوار کا صحیح کام لیا جا سکے۔

درحقیقت یہ بنیادی فکر مغرب کی مادیت ہے جس میں وہ سر سے پیر تک ڈوبا ہوا ہے اور جس کے قلعہ کو وہ مسلسل مستحکم بنا رہا ہے۔اس لئے کہ جب انسان کے پیش نظر اپنی ہی مصلحت ہوگی اور ہر شخص اپنی ہی حیات کے بارے میں سوچے گا۔تسخیر کائنات وتفسیر حیات میں مکمل آزادی ہوگی۔زندگی کا مقصود صرف مادی لذتوں کا حاصل کرنا ہوگا۔جب نفس کا جذبہ سر اٹھائے گا تو وہ تمام برائیاں منظر عام پر آجائیں گی جن سے سرمایہ داری دوچار ہوئی ہے اور جو آج اس کا شاہکار بنی ہوئی ہے۔

حب نفس انسانی فطرت کا وہ عمیق جذبہ ہے جس سے زیادہ ہمہ گیر کوئی جذبہ نہیں ہے۔ دنیا کے سارے جذبات اور نفس کے جملہ خواہشات اسی ایک جذبے کے فروع ہیں۔ معاشیات میں بھی یہی جذبہ کارفرما رہتا ہے۔ انسان جب اپنے نفس کو عزیز رکھتا ہے تو اس کی کوشش ہوتی ہے کہ اپنے آرام کا ہر سامان مہیا کرے اور اپنی تکلیف کے ہر وسیلے کا خاتمہ کر دے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ کسب معاش شروع کرتا ہے، غذائی اسباب مہیا کرتا ہے اور راحت کے لئے ہر تکلیف برداشت کرتا ہے اور جب یہ دیکھ لیتا ہے کہ موت کی مصیبت زندگی کی دشواریوں سے زیادہ آسان ہے تو موت کو حیات پر ترجیح دیتا ہے اور اس طرح خودکشی واقع ہو جاتی ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ انسان کی پوری زندگی کے پس منظر میں ایک ہی جذبہ کارفرما رہتا ہے جس کا نام ہے حب نفس اور جس کی تعبیریں ہیں حب لذت اور بغض الم وغیرہ۔

انسان کو کسی وقت اس بات پر مجبور نہیں کیا جا سکتا کہ وہ دوسروں کے آرام کے لئے خود تکلیف برداشت کرے، ان کی لذت کے لئے اپنے الم کو اختیار کرے یہاں تک کہ اس سے اس کی فطرت کو سلب کر لیا جائے اور اسے دوسری خلقت دے کر لذتوں کا دشمن اور آلام کا دوست بنا دیا جائے۔

آپ انسانی تاریخ میں جن ایثاروں اور قربانیوں کا تذکرہ سنتے ہیں ان کی پشت پر بھی یہی جذبہ کارفرما رہا ہے، انسان نے اپنے بھائی، اولاد اور دوستوں پر جان قربان کی ہے، اخلاقی اقدار اور روحانی مثالوں کی خاطر مصائب برداشت کئے ہیں لیکن ان سب میں اپنے واسطے ایک لذت فرض کر لی ہے اور یہ طے کر لیا ہے کہ اس ایثار سے جو فائدہ ملنے والا ہے وہ قربانی و ایثار سے کہیں زیادہ لذت بخش ہے۔ یہی وہ فلسفہ ہے جس کی روشنی میں انسان کی پوری زندگی کی تفسیر کی جا سکتی ہے اور اس کے ہر عمل و اقدام کی توجیہ ممکن ہے چاہے وہ اپنے لئے ہو یا غیر کے لئے انسان میں لذت حاصل کرنے کی مختلف صلاحیتیں پائی جاتی ہیں۔ اور اس کی لذتیں بھی چند طرح کی ہوتی ہیں ایک مادی لذت ہوتی ہے۔ جس کا

تعلق عمدہ غذا، خوشنما لباس اور بہترین جنسی تسکین سے ہے اور ایک معنوی لذت ہے جس کا تعلق اخلاقی اقدار اور روحانی افکار اور مذہبی عقائد سے ہے۔ انسان ان افکار وعقائد کو بھی اپنی زندگی کا ایک جز سمجھتا ہے۔ اس لئے ان سے بھی ایک لذت محسوس کرتا ہے اب جیسا انسان ہوگا جیسی اس کی صلاحیت وظرفیت ہوگی ویسی ہی اس کی لذت وراحت بھی ہوگی۔ بعض صلاحیتیں ایسی ہوتی ہیں جو فطری طور پر ایک دن پختہ ہو جاتی ہیں جیسے جنسی صلاحیت کہ وہ جوانی میں خود بخود کامل ہو جاتی ہیں اور انسان کو لذت اندوزی پر مائل کرتی ہے اور بعض صلاحیتیں تربیت کی منتظر رہتی ہیں۔ ان کا اظہار اس وقت تک نہیں ہوتا جب تک کہ صحیح تربیت اور مناسب ماحول شامل حال نہ ہو جائے...... یہی وجہ ہے کہ ایک انسان دوسرے کو بھوکا دیکھ کر بھی اپنے ہی کو مقدم کرتا ہے اور دوسرا انسان خود بھوکا رہ کر دوسرے کو سیر وسیراب کر دیتا ہے۔ اور فرق یہی ہوتا ہے کہ پہلے انسان کو صحیح تربیت نہیں مل سکی تو اس کے خلاق اور روحانی جذبات خوابیدہ رہ گئے انہیں بیدار ہونے کا موقع نہیں مل سکا اور دوسرے کو یہ پاکیزہ تربیت میسر آ گئی تو اس کی تمام صلاحیتیں بروئے کار آ گئیں، اسے اخلاقی اور جذباتی افکار سے لذت بھی محسوس ہونے لگی اور اس میں خوئے ایثار بھی پیدا ہوگئی۔

ظاہر ہے کہ جب حب نفس کا جذبہ اتنی گہرائیاں رکھتا ہے اور انسان نفس کو فقط مادی طاقت محسوس کرتا ہے تو اس کا لازمہ یہ ہوگا کہ وہ صرف ان اسباب کے مہیا کرنے کی کوشش کرے گا جن سے مادی راحت ولذت مل سکے۔ اس کے کسب کا دائرہ بھی محدود ہوگا اور اس کی غرض وغایت بھی اپنے ہی دائرہ تک محدود رہے گی۔ وہ تھوڑی سی لذت پر راضی ہو جائے گا اور معمولی راحت کو اپنے لئے بہت کچھ سمجھے گا........ اس کی نظر میں سب سے زیادہ قیمتی شے مال ہوگی۔ وہی ہر لذت مادی کا ذریعہ اور سکون وقتی کا وسیلہ ہے اور یہی چیز وہ ہوگی جو ایک دن اسے سرمایہ دار ذہنیت میں تبدیل کر دے گی اور اس کے پیش نظر صرف اپنی مادی ذات ہوگی اور بس!۔

اب آپ فرمائیں کہ ان مادی افکار ونظریات کے ہوتے ہوئے کیا صرف

انفرادی ملکیت کو ختم کر دینے سے معاشرہ کی اصلاح ہوسکتی ہے اور سماج ان تمام بلاؤں سے نجات پا سکتا ہے؟ ہرگز نہیں۔ معاشرہ کی خوش حالی اس بات پر موقوف ہے کہ ذمہ دار افراد اپنے طریق سے عدول نہ کریں اور ان کا مقصد صرف اصلاحی ہو۔ حالانکہ سرمایہ دار مادیت میں اس کا کوئی امکان نہیں ہے یہاں ذمہ دار افراد کے ذہنوں پر بھی حیات کا وہی مادی تصور مسلط ہے جسے سرمایہ داری نے بنیاد قرار دیا ہے۔ فرق یہ ہے کہ ان لوگوں نے اسے فلسفی سانچے میں ڈھال دیا ہے اور اس کے لئے خوبصورت الفاظ کا انتخاب کر لیا ہے۔

سوچنے کی بات ہے کہ اگر کسی موقع پر حکام کے پیش نظر دو راستے ہو جائیں۔ ایک میں اپنا ذاتی فائدہ اور اپنی مصلحت ہو چاہے دوسروں کا نقصان ہی کیوں نہ ہو جائے اور دوسرے میں دوسرے کا عمومی فائدہ ہو چاہے اپنا نقصان ہی کیوں نہ ہو جائے تو ایسے موقع پر مادہ پرست حکام کس راستے کو اختیار کریں گے اور ان کا طرز عمل کیا ہوگا؟ ظاہر ہے کہ وہ انفرادی فائدے کو اجتماعی مفاد پر مقدم کریں گے اور اس کا سبب صرف شخصی ملکیت کا قانون نہیں ہے کہ اسے مہمل قرار دے کر اس خود غرضی کا علاج کر لیا جائے بلکہ اس کے دوسرے اسباب بھی ہیں جن کا ظہور مختلف شکلوں میں ہوا کرتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ اب اشتراکی ممالک میں بھی خیانت کے مجرم تخت حکومت سے اتارے جانے لگے ہیں حالانکہ وہاں شخصی ملکیت کا کوئی تصور نہیں ہے۔

سرمایہ داری اور اشتراکیت میں فرق یہ ہے کہ سرمایہ دارانہ نظام میں آزادی و حریت کے نتیجہ میں جمع ہونے والی دولت اشتراکی ملک میں اس ایک جماعت کے حوالے کر دی جاتی ہے جو حکومت کی نمائندگی اور ملک کا انتظام کرتی ہے۔ ظاہر ہے کہ اس جماعت کے عقائد وافکار بھی وہی ہوتے ہیں جو سرمایہ داری کے تھے۔ حیات کا مادی مفہوم اُن کے ذہنوں میں بھی تھا، اِن کے ذہنوں میں بھی ہے، جب نفس کا جذبہ ان کے دل میں بھی تھا ان کے دل میں بھی ہے۔ ذاتی مصالح کو مقدم رکھنے کی تڑپ ان کے نفس میں بھی تھی ان کے نفس میں بھی ہے، اخلاقی اقدار اور روحانی افکار کے وہ بھی منکر تھے اور یہ بھی منکر ہیں تو کیا

ان سے اسی خطرہ کا اندیشہ نہیں ہے جس سے اب تک انسانیت دو چار تھی اور کیا یہ سماج کو اسی طرح تباہ و برباد نہ کریں گے جس طرح اب تک کے لوگ کر رہے تھے؟

حقیقت یہ ہے کہ یہ سب کچھ ہوگا اس لئے کہ بنیادی خطرہ حیات کا مادی مفہوم ہے اور وہ دونوں کے ذہنوں میں مشترکہ طور پر پایا جاتا ہے۔ دولت کو ایک مرکز پر جمع کر کے ایک ایسی حکمراں جماعت کے حوالے کر دینا جس کے ذہن کی تشکیل جدید نہ ہوئی ہو، اتنا ہی خطرہ رکھتا ہے جتنا خطرہ ان سرمایہ داروں سے تھا جن کے پاس یہ دولت بٹی ہوئی تھی۔ ہاں اتنا فرق ضرور ہے کہ سرمایہ دار لوگ خود ان اموال کے مالک تھے اور ان کے فوائد ومنافع سے بہرہ اندوز ہوتے تھے اور یہ بیچارے حکام قانونی طور پر نہ ملکی سرمائے کے مالک کہے جاتے ہیں اور نہ انہیں اس کے استعمال کرنے کا حق ہے یہ اور بات ہے کہ نفس وہی نفس ہے اور فلسفہ وہی فلسفہ، مفاد پرستی اسی انداز کی ہے اور فلسفیانہ نظام بعینہ وہی۔

مشکل کا صحیح حل

ایسے حالات میں عالم انسانیت کے سامنے دو ہی راستے ہیں۔ ایک یہ کہ انسان کی فطرت میں تبدیلی کر کے اسے دوسرے قلب و دماغ، دوسرے ذہن و مزاج اور دوسرے جذبات و احساسات کا انسان بنا دیا جائے۔ ایسے جذبات جہاں ذاتی منفعت کا خیال نہ ہو، شخصی مفاد بے قیمت ہو، سماج پر قربان ہو جانا عین سعادت ہو اور پھر حیات کا مفہوم وہی مادی مفہوم ہو، زندگی اسی چندروزہ لذت و راحت کا نام ہو، ظاہر ہے کہ یہ بات اسی وقت ممکن ہے جب انسان کے دل کی گہرائیوں سے حب نفس کا جذبہ نکال لیا جائے یا اسے حب جماعت سے بدل دیا جائے تاکہ اب ایسے انسان پیدا ہوں جنہیں اپنی ذات سے دلچسپی نہ ہو، اپنی منفعت سے سروکار نہ ہو وہ صرف سماج کی خدمت کرنا جانتے ہوں اور سماج پر قربان ہونا چاہتے ہوں۔

دوسرا راستہ یہ ہے کہ حیات کا مادی تصور بدل دیا جائے اور انسان کو مادیت سے بلند و بالا بنا دیا جائے تاکہ اس کے مقاصد و اغراض، افکار و اقدار سب میں تغیر پیدا ہو جائے اور معاشرے کی اصلاح کا معجزہ آسانی کے ساتھ وقوع پذیر ہو سکے۔

پہلا خواب وہ ہے جسے اشتراکیت کے پرستار مسلسل دیکھتے رہے ہیں اور ان کا خیال ہے کہ مستقبل میں یہ خواب شرمندہ تعبیر ہو جائے گا۔ جب انسان کی ایک نشاۃ ثانیہ ہو گی اور اس کے جذبات عوامی مفاد کی تحصیل کی طرف مڑ جائینگے، مصلحت پرستی کا خاتمہ ہو جائے گا اور ہر شخص اجتماع کا خادم ہو گا۔ لیکن اس کے لئے ضروری ہے کہ عالم کی قیادت

اشترا کی حکام کے حوالے کر دی جائے تا کہ وہ ایک ماہر ڈاکٹر کی طرح انسانی نفسیات کا علاج کریں۔ فاسد اجزا کو الگ کر دیں، اور ٹیڑھے اعضا کو سیدھا کر دیں۔لیکن اب یہ کام کتنے عرصے میں مکمل ہو سکے گا اس کا کوئی صحیح اندازہ نہیں ہے۔ یہ اور بات ہے کہ دنیا کا ایک ایسے نظام کی طرف بھی مائل ہونا اس بات کا زندہ ثبوت ہے کہ دنیا سرمایہ داری کے مظالم سے عاجز آ چکی ہے اور اس میں پر فریب نعروں کی برداشت کی قوت باقی نہیں رہ گئی ہے۔ اس نے انسان سے اس کی شرافت کو سلب کر لیا ہے اور معاشرہ کا خون چوس کر چند سرمایہ داروں کے پیالوں میں بھر دیا ہے۔

انسان کی نشاۃ ثانیہ کا بنیادی خیال مارکسیت کی حب نفس کے بارے میں منفرد رائے ہے یہ لوگ جذبہ حب نفس کو انسان کا فطری جذبہ نہیں سمجھتے بلکہ ان کا خیال ہے کہ یہ جذبہ حالات کی پیداوار ہے۔ انسان ایک مدت دراز سے ایسے ماحول سے دو چار رہا ہے جس میں شخصی ملکیت کے اصول کارفرما رہے ہیں، اس لئے اس میں جذبہ پیدا ہو گیا ہے اور وہ اپنے نفس سے محبت کرنے لگا ہے۔ اب اگر کوئی انقلاب رونما ہو جائے جہاں انفرادی ملکیت ختم ہو جائے اور اس کی جگہ اجتماعی ملکیت کو مل جائے تو انسانی نفسیات بالکل منقلب ہو جائیں گے اور اس کے دل میں حب نفس کے بجائے حب معاشرہ کا جذبہ پیدا ہو جائے گا وہ اپنے فائدہ کے بجائے عوامی مفاد کے بارے میں سوچنے لگے گا اور زمانہ کی حالت میں عظیم تغیر رونما ہو جائے گا۔۔۔لیکن حقیقت یہ ہے کہ جذبہ حب نفس کی یہ تفسیر انسانی کیفیت کی الٹی ترجمانی ہے اور جذبہ کو سماج کی پیداوار قرار دینا عقل ومنطق کی صریحی مخالفت ہے، بھلا یہ کیسے ممکن ہے کہ انسان کے نفسانی جذبہ کو شخصی ملکیت والے ماحول کا نتیجہ قرار دے دیا جائے جبکہ دیکھا یہ جا رہا ہے کہ شخصی ملکیت کا قانون ہی اسی جذبہ کی پیداوار ہے۔ انسان میں اگر اپنے نفس سے محبت کا جذبہ نہ ہوتا تو وہ کبھی شخصی ملکیت یا ذاتی منفعت کے بارے میں نہ سوچتا۔ یہ فکر خود ہی دلیل ہے کہ وہ اپنے اندر ایک ایسے جذبے کو چھپائے ہوئے ہے جو اسے ایسے اقدامات پر آمادہ کر رہا ہے اور اپنا نقصان کر کے سماج کو فائدہ پہنچانے کی

طرف مائل نہیں ہونے دیتا۔ ایسے حالات میں انفرادی ملکیت کا خاتمہ کر دینا سماج کی اصلاح نہیں کر سکتا۔ بلکہ ضرورت اس دل کے چور کو ختم کرنے کی ہے جو بہرحال اپنا کام کرتا رہے گا چاہے انفرادی ملکیت کا قانون ختم ہی کیوں نہ ہو جائے۔

علاوہ اس کے اگر یہ تسلیم بھی کر لیا جائے کہ نفسیاتی جذبہ سماجی حالات کی پیداوار ہے تو اتنا تو بہرحال ماننا پڑے گا کہ شخصی ملکیت کے خاتمہ سے یہ جذبہ ختم نہیں ہو سکتا بلکہ اس کے لئے سماج سے ان تمام مظاہر کو ختم کرنا پڑے گا جن میں شخصیت کی جھلک پائی جاتی ہو اور انفرادیت کی بو آتی ہو اور انہیں مظاہر میں سے ایک ''خصوصی انتظام'' کا مسئلہ ہے جس کا وجود اشتراکی نظام میں بھی پایا جاتا ہے۔ اشتراکیت میں ملکی دولت کا انتظام پورے معاشرہ کے حوالے نہیں کیا گیا بلکہ چند مخصوص افراد کے سپرد کر دیا گیا ہے کہ وہ اپنی عقل و فکر کے مطابق اس کا انتظام کریں۔ ظاہر ہے کہ یہ انتظامات کی خودرائی اور انانیت انسان کے اندر اس جذبہ کو بیدار کرتی رہے گی جس کے خاتمہ کے لئے شخصی ملکیت کو ختم کرنے کا قانون وضع کیا گیا تھا۔

معلوم یہ ہوا کہ انسانی مشکل کو حل کرنے کا پہلا طریقہ وہ خواب ہے جو کبھی شرمندۂ تعبیر نہیں ہو سکتا نہ انسان بدلا جا سکتا ہے اور نہ اس کے جذبات کا خاتمہ ہو سکتا ہے۔ شخصی ملکیت رہے یا نہ رہے دوسرا حل وہ ہے جسے اسلام نے پیش کیا ہے۔ اس کا دعویٰ ہے کہ انسانی مشکلات کا حل صرف یہ ہے اس کی مادی تفسیر اور زندگی کی مادی تعبیر کو ختم کر دیا جائے۔ انسان کو اخلاقی اقدار اور روحانی افکار کا خوگر بنایا جائے تاکہ اس طرح مقام عمل میں وہ خود ہی اجتماع پرست ہو جائے اور یہی وجہ ہے کہ اس نے اپنی اصلاح و تعمیر کا آغاز شخصی ملکیت کے خاتمے سے نہیں کیا بلکہ اپنی پوری قوت اس بات پر صرف کر دی کہ حیات کا موجودہ مفہوم بدل کر اس کی جگہ ایک نیا مفہوم رکھا جائے۔ وہ مفہوم جس میں نہ فرد سماج کا مکینیکل آلہ ہو اور نہ سماج فرد کی گردن پر بار گراں ہو بلکہ دونوں کے الگ الگ حقوق ہوں اور ہر ایک کے حق کا تحفظ کیا جائے۔ انسان کی مادی اور معنوی دونوں قسم کی بزرگی کا لحاظ رکھا جائے۔

اسلام نے اس طرز فکر سے سماج کی اس دکھتی ہوئی رگ پر ہاتھ رکھا ہے جو ہر برائی کی جڑ اور ہر تباہی کی اصل تھی اس نے دیکھا کہ مرض کی وہ جڑ جس نے سارے عالم کو تباہ کر رکھا ہے اور جس سے انسانیت کی پوری دنیا نالاں وفریاد کناں ہے، وہ حیات کا مادی مفہوم ہے جس میں ہر شخص مفاد پرست اور خود غرض ہے ہر ایک کے پیش نظر چند روزہ زندگی اور غیر دائمی لذت وراحت ہے، جو ہے وہ اپنی ذاتی مصلحت کو معیار زندگی بنائے ہوئے ہے اور اسی کے لئے جدو جہد کر رہا ہے۔

سرمایہ داری اسلام کی نظر میں ناپائیدار نظام کا نام ہے لیکن اس لئے نہیں کہ اس میں شخصی ملکیت کا اعتراف کیا گیا ہے جیسا کہ اشتراکیت کا خیال وعقیدہ ہے، بلکہ اس لئے کہ اس کی بنیاد ایک مادی فلسفہ پر ہے جس کے بعد خود غرضی اور مصلحت پرستی ضروری ہو جاتی ہے۔ اس کی نظر میں نورانی زندگی اور روشن مستقبل کی تعمیر کے لئے اس مفہوم کا بدلنا انتہائی ضروری ہے۔ وہ حیات کو نیا مفہوم دینا چاہتا ہے۔ سیاست کو نئی راہوں پر چلانا چاہتا ہے۔ عالمی مسائل کو نئے زاویہ نگاہ سے دیکھنا چاہتا ہے۔ اور یہی اس کا حقیقی پیغام ہے جسے اس نے صبح قیامت تک کے لئے پیش کیا ہے اور جس کے اصول وقوانین حیات وکائنات کے جدید مفہوم سے حاصل کئے گئے ہیں۔ اسلام نے حیات کے مفہوم میں یہ تازگی پیدا کی کہ انسانی زندگی ایک لامحدود زندگی کے فیض کرم کا نتیجہ ہے اور وہ ایک دن ایک ایسے عالم کی طرف منتقل ہو جائے گی جہاں نہ دکھ درد ہوگا نہ رنج ومصیبت۔ اس کے اعمال وافعال کردار ورفتار کا ایک مکمل معیار ہے اور وہ ہے رضائے الٰہی اب نہ ہر مفید ومنفعت بخش حلال ہے اور نہ ہر مضر ونقصان دہ حرام ہے بلکہ معیار رضائے الٰہی ہے جس عمل سے جس قدر رضائے الٰہی حاصل ہو سکے وہ اتنا ہی مستحق ہے اور جو جس قدر رضائے الٰہی سے دور کر سکے وہ اتنا ہی قبیح و شر ہے۔ صحیح انسان وہ ہے جو اس ہدف کو پیش نظر رکھے اور سچا انسان وہ ہے جو اس مقصد کو حاصل کر کے اپنی پوری زندگی اسی کے سانچے میں ڈھال دے۔

حیات وانسانیت کے مفاہیم میں یہ زبردست تغیر انسان کو ایک نیا وجود نہیں دینا

چاہتا اور نہ اشتراکیت کی طرح اس کے گہرے جذبات کو سلب کر لینا چاہتا ہے، اس لئے کہ یہ جذبات فطری ہیں اور ان کا سلب کرنا ناممکن ہے بلکہ تجربہ شاہد ہے کہ پوری تاریخ انسانیت میں اس جذبہ سے زیادہ کسی جذبے نے کام نہیں کیا ہے۔ یہ جذبہ نہ ہوتا تو پہلا ہی انسان اپنی ضروریات کی فکر نہ کرتا اور اس طرح آئندہ نسل بھی وجود میں نہ آسکتی۔ یہی ضرورتیں تھیں جنہوں نے معاشرے کو جنم دیا اور انسانی تعلقات کو عام کیا لہٰذا ان کا انکار ناممکن ہے.........ضرورت ایک ایسے نظام کی ہے جو ان جذبات کی قدر بھی کرتا ہو۔ انسان میں تغیر کو ناممکن بھی سمجھتا ہو اور انسانیت کی اس مشکل کو حل بھی کر دے۔

اسلام کا پیغام

ایک ایسا ہی پیغام دینا چاہتا ہے جس میں ان دونوں باتوں کا لحاظ رکھا گیا ہو۔ حب نفس کا فطری جذبہ بھی زندہ و بیدار رہے اور وہ اخلاقی اقدار بھی عام ہو جائیں جنہیں انسانی فلاح کے لئے وضع کیا گیا ہے۔ بظاہر یہ دونوں باتیں متضاد ہیں۔ حب نفس کا تقاضا ہے کہ انسان صرف اپنے فائدے کے بارے میں سوچے اور اپنی مصلحت کے لئے قدم اٹھائے اور اخلاقی اقدار کا مطالبہ ہے کہ سماج کی خدمت کی جائے، معاشرے کو فائدہ پہنچایا جائے، چاہے اپنا نقصان ہی کیوں نہ ہو جائے۔لیکن اسلام کا کارنامہ یہی تھا کہ اس نے ان دونوں عناصر کو ایک محل پر جمع کر دیا اور انسان کے مختلف جذبات میں وحدت پیدا کر دی۔ اس سلسلے میں اس نے دو طریقے اختیار کئے ہیں۔

﴿۱﴾ حیات کی وہ سچی تصویر کشی کی جس میں زندگی آخرت کا پیش خیمہ بن گئی۔ دنیا کشت آخرت نظر آنے لگی۔ انسان کو یہ محسوس ہونے لگا کہ اس دنیا کے بعد بھی ایک عالم ہے جہاں یہاں کے اعمال کی جزا ملے گی اور جو جس قدر رضائے الٰہی کا حامل ہوگا، اسی قدر سکون واطمینان کا حقدار بھی ہوگا، نتیجہ یہ ہوا کہ شخصی منفعت ہی اجتماعی فائدے کی بنیاد بن گئی اور انسان سماج کی خاطر یہ سوچ کر قربانیاں پیش کرنے لگا کہ یہ قربانیاں رائیگاں نہ جائیں گی بلکہ ان کے عوض میں دوسرے عالم میں اس سے کہیں زیادہ مل جائے گا۔ ظاہر ہے

کہ آدمی کام کر رہا تھا اس اُخروی اجر کی لالچ میں جو حب نفس کا تقاضا تھا اور اس کے ضمن میں پوری ہو رہی تھی معاشرے کی خدمت جو اس فکری انقلاب کا مقصود و مطلوب تھی۔

حیات کی اس جامع تفسیر نے جماعت کے مسئلے کو فرد کا مسئلہ بنا دیا اور انسان کو سماج کی خدمت پر مجبور کر دیا حالانکہ کھلی ہوئی بات ہے کہ اگر یہ آخرت کا تصور نہ ہوتا اور حیات صرف مادی حیات رہتی تو ایسا کچھ نہ ہو سکتا اور انسان صرف اسی دنیا کی لذت و راحت کے بارے میں سوچتا رہ جاتا، اس کے سامنے یہیں کا فائدہ ہوتا اور یہیں کا نقصان۔

اسلام نے اپنے ان افکار کو متعدد قرآنی آیات میں ظاہر کیا ہے جن کا ایک خاکہ یہ ہے۔

مَنْ عَمِلَ صَالِحًا فَلِنَفْسِهٖ ۚ وَمَنْ اَسَآءَ فَعَلَيْهَا ۫

جو انسان نیک کام کرے گا وہ اسی کے کام آئے گا اور اگر برائی کرے گا تو وہ بھی اسی کے سامنے آئے گی۔ [۱]

مَنْ عَمِلَ سَيِّئَةً فَلَا يُجْزٰٓى اِلَّا مِثْلَهَا ۚ وَمَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَاُولٰٓئِكَ يَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ يُرْزَقُوْنَ فِيْهَا بِغَيْرِ حِسَابٍ ۝

جو شخص بھی کوئی عمل خیر کرے گا چاہے وہ مرد ہو یا عورت اسے جنت میں بے حساب رزق دیا جائے گا بشرطیکہ صاحب ایمان بھی ہو۔ [۲]

يَوْمَئِذٍ يَّصْدُرُ النَّاسُ اَشْتَاتًا ۙ لِّيُرَوْا اَعْمَالَهُمْ ۝

آج لوگ متفرق طور پر اس لئے اٹھائے جائیں گے تا کہ انہیں ان کے اعمال دکھائے جائیں۔ اب جس نے ذرہ

---

[۱] سورۂ الجاثیہ: ۱۵

[۲] سورۂ غافر: ۴۰

برابرعمل خیر کیا ہے وہ بھی دیکھے گا اور جس نے ذرہ برابر برائی
کی ہے وہ بھی دیکھے گا۔[1]

ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ لَا يُصِيْبُهُمْ ظَمَاٌ وَّلَا نَصَبٌ وَّلَا مَخْمَصَةٌ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَلَا يَطَـُٔوْنَ مَوْطِئًا يَّغِيْظُ الْكُفَّارَ وَلَا يَنَالُوْنَ مِنْ عَدُوٍّ نَّيْلًا اِلَّا كُتِبَ لَهُمْ بِهٖ عَمَلٌ صَالِحٌ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۱۲۰﴾ وَلَا يُنْفِقُوْنَ نَفَقَةً صَغِيْرَةً وَّلَا كَبِيْرَةً وَّلَا يَقْطَعُوْنَ وَادِيًا اِلَّا كُتِبَ لَهُمْ لِيَجْزِيَهُمُ اللّٰهُ اَحْسَنَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۲۱﴾

یہ اس لئے کہ مسلمانوں کو کوئی بھوک پیاس یا دشواری وتعب راہ خدا میں ایسی نہ ہوگی جس کا اجر نہ ملے۔ انہیں ہر ہر قدم پر اجر ملے گا اور ہر ہر درد و رنج کا معاوضہ دیا جائے گا خدا کسی کے اجر کو ضائع نہیں کرتا۔ یہ لوگ کوئی چھوٹا بڑا خرچ کریں گے تو وہ بھی اور اگر کوئی وادی طے کریں گے تو وہ بھی سب لکھ لیا جائے گا اور انہیں ان کے عمل سے بہتر اجر دیا جائے گا۔[2]

﴿۲﴾ اخلاق کی ایسی تربیت کی جس میں روحانی غذا کا انتظام ہو اور انسانی جذبات واحساسات کو ایک خاص سانچے میں ڈھالا جا سکے۔ اس لئے کہ انسان کے اندر چند مختلف رجحانات ومیلانات پائے جاتے ہیں۔ بعض کا تعلق مادیت سے ہے جن کی خواہش فطری طور پر ظاہر ہوتی ہے، جیسے کھانے پینے اور جنسی لذت حاصل کرنے کا رجحان

---

[1] سورۂ الزلزلہ:٦

[2] سورۂ التوبہ:١٢٠،١٢١

ہے اور بعض کا تعلق روحانیت سے ہے جن کا ظہور تعلیم وتربیت اور نگرانی کا محتاج ہے اور یہی وجہ ہے کہ انسان جب بے تربیت رہ جاتا ہے تو اس پر مادی خواہشات کا غلبہ ہو جاتا ہے۔ اور معنوی رجحان پردۂ خفا میں رہ جاتے ہیں......دین چونکہ ایک معصوم قیادت کا علمبردار ہوتا ہے اس لئے وہ اخلاقی تربیت کو اسی معصوم قیادت کے حوالے کر دیتا ہے اور اس قیادت کے زیر سایہ ایسے احساسات وجذبات کی پیداوار ہوتی ہے جن کے بعد انسان اخلاقی اقدار اور انسانی کردار کے اپنانے پر فطرتاً مجبور ہو جاتا ہے۔ ذاتی منافع کا تصور محو ہو جاتا ہے اور اجتماعی مفاد زندگی کا مطمح نظر بن جاتا ہے۔

اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ نفس سے حب ذات کا جذبہ محو ہو جاتا ہے اور انسان نشاۃ ثانیہ کی منزل میں آجاتا ہے۔ بلکہ یہ اخلاق وکردار خود حب ذات کی تفسیر بن جاتا ہے اور انسان اجتماعی مفاد کے مقدم رکھنے ہی کو اپنے نفس سے سچی محبت خیال کرتا ہے۔ اب اخلاقی قدریں اس کی ذاتی لذت کا سبب ہوتی ہیں اور اجتماعی مفاد اس کے نفس کی تسکین کا باعث ہوتا ہے۔

اسلام نے انہیں دو طریقوں سے افراد کے مسئلے کو اخلاق کا مسئلہ اور ذات کے مسئلے کو جماعت کا مسئلہ بتایا ہے۔ ایک طریقہ کا نچوڑ انسان کو حیات کی صحیح تصویر دکھلانا اور اس کو زندگی کے آغاز وانجام سے روشناس کرانا ہے تا کہ وہ اخلاقی قدروں کے احترام پر آمادہ ہو سکے اور اجتماعی مفادات کا خیال کر سکے اور دوسرے کا ماحصل اخلاقی تربیت ہے جس میں جذبات واحساسات کی نئی تشکیل ہو اور انسان جماعت کے مسئلہ کو فرد کا مسئلہ سمجھنے لگے۔ ہم نے انہیں دونوں طریقوں کا نام ''حیات کا معنوی تصور'' اور ''زندگی کا اخلاقی احساس'' قرار دیا ہے۔ ''معنوی تصور'' اور ''اخلاقی احساس'' ہی وہ اہم بنیادیں ہیں جن پر اسلام کے جامع معیار کی تعمیر کی گئی ہے اور اسلام نے اس جامع اور ہمہ گیر معیار کا نام رضائے الٰہی رکھا ہے۔ یہی رضائے الٰہی اسلامی زندگی کا صحیح معیار اور انسانی سفینے کو ساحل مراد تک پہنچانے کا واحد ذریعہ ہے۔

اسلام نے اپنی تشکیلات میں فرد و اجتماع دونوں کو ایک نظر سے دیکھا ہے۔ اس کا مقصد فرد و معاشرے کے درمیان صحیح توازن قائم کرنا ہے وہ نہ فرد کو تشریع احکام کی بنیاد قرار دینا چاہتا ہے اور نہ معاشرہ کو کوئی مرکزی حیثیت دینا چاہتا ہے۔ اس کا عقیدہ یہ ہے کہ جس نظام میں یہ توازن نہ ہوگا وہ زندگی کا صالح دستور نہیں بن سکتا۔ اس میں یا تو فردی خواہشات کا احترام ہوگا اور معاشرہ خطرات و مصائب کا شکار ہو جائے گا یا فردی خواہشات پر پابندی عائد کی جائے گی اور فرد اور تشریع میں داخلی جنگ چھڑ جائے گی اور اس طرح اجتماعی نظام خطرہ میں پڑ جائے گا۔ دوسروں کی خواہشات پامال کی جائیں گی اور حکام کی خواہش پرستی کا دروازہ پاٹوں پاٹ کھل جائے گا۔ اس لئے ضروری ہے کہ انسان کو اخلاقی تربیت دے کر ایک ایسے سانچے میں ڈھال دیا جائے کہ وہ ذاتی مفاد کی قربانی کو اپنے اوپر جبر نہ سمجھے بلکہ اسے اپنی ترقی کا ذریعہ اور زندگی کا اعلیٰ مقصد تصور کرے۔

معنوی زندگی اور اخلاقی تربیت سے ہٹ کر جو نظام بھی بنایا جائے گا وہ انسانی جذبات کو محدود تو کر سکتا ہے افراد کی خواہشات پر پابندی تو عائد کر سکتا ہے لیکن جذبات و تشریعات اور خواہشات و تعلیمات میں توازن نہیں قائم کر سکتا اور توازن کا نہ ہونا ہی نظام کی تباہی کے لئے کافی ووافی ہے۔

اسلام نے انہیں خطرات کو محسوس کر کے معنوی تصور اور اخلاقی تربیت کو بنیادی مقصد قرار دیا ہے اور یہ طے کر دیا کہ اپنی پوری تشریع کو انہیں دونوں محوروں پر گردش دے گا۔ اس کا نظریہ یہ ہے کہ انسان کو معنوی زندگی اور اخلاقی احساس سے الگ کرنے کے بعد اجتماعی سکون و اطمینان کی توقع ایک وہم و خیال سے زیادہ کچھ نہیں ہے۔ اخلاقی اقدار کا انکار اور ''اقتصادی عامل'' پر ایمان انسانی زندگی کی اصلاح اس وقت تک نہیں کر سکتے جب تک انسان کو ایک ایسا مکینکل آلہ نہ بنا دیا جائے جس پر جذبات کی جگہ پر سوجھ کام کر رہے ہوں اور احساسات کی جگہ آلات کو دے دی گئی ہو۔

معنوی زندگی اور اخلاقی احساس کی بنیاد پر انسانی زندگی کی تشکیل کوئی بڑا دشوار

گزارا ممکن نہیں ہے جس سے مایوسی لازمی قرار دے لی جائے۔ بلکہ یہ کام وہ ہے جسے صدیوں سے آسمانی مذاہب انجام دے رہے ہیں اور حقیقت یہ ہے کہ آج کے دور میں پائے جانے والے معنوی تصورات، اخلاقی اقدار پاکیزہ احساسات اور صحیح جذبات کی کوئی صحیح توجیہہ اس کے علاوہ نہیں ہو سکتی کہ ان سب کو انہی مذاہب کی صدہا سال کی خدمتوں کا نتیجہ قرار دیا جائے اور یہ تسلیم کر لیا جائے کہ یہ انہی سماوی ادیان کی زحمتوں اور مشقتوں کا باقی ماندہ اثر ہیں۔

اسلام نے اپنی نورانی مشعل بشریت کی محفل میں اس وقت روشن کی جب انسانی فکر میں کچھ نورانیت آ چکی تھی۔ بشری ذہن کسی قدر انکار سے ناآشنا ہو چکا تھا۔ اس لئے اس نے معنوی زندگی اور اخلاقی احساس کے تصور کو اور بھی وسیع کر دیا اور رضائے الٰہی کا ایک ایسا پرچم لہرا دیا جس کے زیر سایہ ۴/۱ دنیا آ گئی........ اسلام کا مقصد یہ تھا کہ پورے عالم بشریت کو ایک نقطہ پر جمع کر دے اور سب کی مرکزی فکر کو متحد بنا دے اس کی نظر میں اسلامی حکومت کے دو اہم اور بنیادی فرض تھے ایک انسان کو فکری اور ذہنی اعتبار سے اسلامی افکار کے سانچے میں ڈھال کر ذہنوں کو جدید تشکیل کرنا اور دوسرے باہر سے اس تربیت کی نگرانی کرنا تا کہ صراط مستقیم سے ہٹنے والے کو پھر راہ راست پر لایا جا سکے۔ اور یہی وجہ تھی کہ اس نے اپنی فکر کو صرف ایک ذہنی تصور نہیں بنایا بلکہ اپنے نظام کو ایک ایسی سیاسی فکر کے سانچے میں ڈھال دیا جس میں حیات و کائنات سیاست و اجتماع، اقتصاد و اخلاق سارے مسائل سمٹ آئیں۔ اس کے علاوہ سارے نظام وہ ہیں جو یا تو انسانی مسائل کو روکنے اور سمجھنے کے لئے کوئی معین زاویہ نظر نہیں رکھتے یا ان کا زاویہ نظر خالص مادی ہے جو انسانیت کو ہر طرح تباہ و برباد کرنے کے لئے کافی ہے۔

اسلام اور حریت وضمانت

گذشتہ صفحات میں یہ واضح کیا جاچکا ہے کہ سرمایہ داری اور اشتراکیت دو مرکزی محوروں پر گردش کر رہی ہیں۔ سرمایہ داری کا محور ہے حریت، اور اشتراکیت کا محور ہے اجتماعی ضمانت.........

اسلام کو واضح کرنے کے لئے ہمیں ان سب کا ایک تقابلی مطالعہ کرنا پڑے گا جس میں سرمایہ داری کا مقابلہ حریت کے میدان میں ہوگا اور اشتراکیت کا مقابلہ اجتماعی ضمانت کے میدان میں۔

حریت سے ہماری مراد لفظ کے عام لغوی معنی ہی ہیں یعنی ''غیر کے جبر کی نفی'' اس لئے کہ یہی معنی دونوں نظاموں میں مشترکہ طور پر پائے جاتے ہیں اور اسی معنی کے اعتبار سے اسلامی ارشادات میں اس لفظ کا استعمال ہوا ہے۔

امیر المومنینؑ کا ارشاد ہے

کسی غیر کے غلام نہ بنو خدا نے تمہیں آزاد پیدا کیا ہے

اور امام جعفرؑ صادق فرمایا کرتے تھے

جس میں پانچ باتیں نہ ہوں اس سے زیادہ خیر کی توقع نہیں ہے۔ وفا، تدبیر، حیا، حسن اخلاق، اور ان سب کی جامع صفت حریت۔''

حریت کا لفظ سرمایہ دارانہ نظام کی پیداوار نہیں ہے یہ اور بات ہے کہ اس نظام

نے اس کے عام معنی میں اپنے فکری اور نظریاتی خصوصیات کو شامل کر کے اسے اپنا شعار بنا لیا ہے اور اس کے اصلی معنی کو مسخ کر دیا ہے۔

سرمایہ دار معاشرہ کی حریت اور اسلامی اجتماع کی حریت کا نمایاں فرق یہ ہے کہ سرمایہ دارانہ حریت کا آغاز بے پناہ شک سے ہوتا ہے جو انقلابی منزل میں خود مختاری کی شکل میں تحلیل ہو جاتا ہے اور ہر انسان اپنے آپ کو اپنا مختار سمجھنے لگتا ہے اور اسلامی معاشرہ کی حریت کی بنیاد اللہ پر ایمان ہے جس میں انقلابی معنی خود بخود پوشیدہ ہیں کہ جتنا یہ عقیدہ پختہ ہوگا اتنا ہی انقلابی جذبہ عام وتام ہو جائے گا۔

دوسرے لفظوں میں یوں کہا جائے کہ سرمایہ دارانہ حریت ایک مثبت مفہوم ہے جس میں ہر انسان اپنے معاملات میں اس قدر خود مختار ہیں اور اسلامی حریت ایک ایسا انقلابی تصور ہے جس میں انسان اللہ کا بندہ اور دنیا کی ہر طاقت سے بلند و بالا ہو جاتا ہے اس کے ذہن میں یہ بات راسخ ہو جاتی ہے کہ اس پوری کائنات کا خالق و مالک ایک ہے۔لہٰذا اس کے سامنے مجھ میں اور دوسرے افراد میں کوئی فرق نہیں ہے۔سب اسی کے بندے ہیں اور سب کا وہی ایک حاکم و مالک ہے۔اب کسی انسان کو اپنے نفس پر بھی تصرف کرنے کا کوئی حق نہیں ہے۔ یا یوں کہہ لیجئے کہ سرمایہ دار حریت خود مختاری ہے اس لئے ہر انسان حریت پر اختیار رکھتا ہے اور اسے ساقط کر کے غلامی اختیار کر سکتا ہے لیکن اسلامی حریت بندگی کا نتیجہ ہے اس لئے کسی آدمی کو بھی اس کے ساقط کرنے کا حق نہیں ہے۔

''کسی غیر کے غلام نہ بنو کہ خدا نے تمہیں آزاد پیدا کیا ہے۔''

سرمایہ دارانہ معاشرے کی حریت

مذکورہ بالا اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ سرمایہ دار معاشرے میں آزادی اس ہمہ گیر شک کا نتیجہ ہے جو یورپ کی پوری ذہنیت پر مسلط ہو چکا تھا اور جس نے ہر شعبہ زندگی سے اعتبار ختم کر لیا تھا۔ ہر تحقیق جدید انکشافات کی روشنی میں وہم دکھائی دے رہی تھی اور ہر عقیدہ تازہ تحقیقات کی روشنی میں تو ہم وجنون علمی انقلابات کا دور دورہ تھا۔فکر وعقیدہ کے

بت یکے بعد دیگرے ٹوٹ کر گر رہے تھے۔ حیات و کائنات کے نئے مفاہیم تیار ہو رہے تھے اور انسان کی عقلی اور دینی شخصیت کا نیا سنگ بنیاد رکھا جا رہا تھا۔

ان انکشافات اور انقلابات کا نتیجہ یہ ہوا کہ مغرب کے انسان نے کائنات کو نئی عینک سے دیکھنا شروع کر دیا اور ماضی کے تمام تر کے شک و شبہ کی نظر سے دیکھے جانے لگے۔ فکری میراث کا اعتبار اٹھتا گیا اور جدید تخلیقات نے اپنا اعتبار جمانا شروع کر دیا۔ اب صورت یہ ہوگئی کہ ''بطلیموس'' کا انکشاف کیا ہوا عالم اس عالم سے بالکل مختلف ہو گیا جس کا انکشاف ''کوپرنیکوس'' نے کیا اور جس میں زمین کی حیثیت آفتاب کے ایک تابع کی تھی اور بس۔ ''گلیلو'' وغیرہ کی انکشاف کردہ طبیعت اس طبیعت سے بالکل جداگانہ دکھائی دینے لگی جس کا پتہ علمائے مذہب اور روسائیت نے دیا تھا۔ ''تھامس اکوینی'' اور ''ڈانٹے'' کے فلسفے ہوا میں اڑتے نظر آئے اور کل کے بدیہیات آج کے خرافات و اوہام بن گئے۔

یہیں تک بات محدود نہ رہی بلکہ اخلاقی قدریں اور تربیتی اصول بھی شک و شبہ کی روشنی میں دیکھے جانے لگے اور یہ ہونا بھی چاہئے تھا اس لئے کہ اب اس طور خیالات بے اختیار ہو چکے تھے اور سارا عالم اپنے حالات اور ماحول کو علم و اعتبار کی نظروں سے دیکھ رہا تھا غیبی تصورات مشاہدات کی مار کھا چکے تھے اور اخلاقی و اقدار علمی انقلابات کی نذر ہو چکے تھے۔

مغرب کا مذہب جو اب تک جذبات کی بنیاد پر پروان چڑھ رہا تھا اور جس میں ''کنیسہ'' کے مظالم و مصائب حد آخر تک پہنچ چکے تھے۔ ایک نئے شک کا شکار ہو گیا اور اس کا بھیانک اثر یہ ہوا کہ اخلاقی قدریں بھی اسی کی زد میں آ گئیں۔ تحقیقات و انکشافات سے مدہوش ہونے والا یہ نہ سوچ سکا کہ ''کنیسہ'' کا کردار الگ ہے اور اخلاقی اقدار الگ، جذباتی افکار الگ ہیں اور عقلی نظریات و اصول الگ۔

بات اصل یہ تھی کہ اخلاقی اصول و قواعد مذہب سے پوری طرح وابستہ تھے اور جب مذہب ہی کی بنیاد متزلزل ہوگئی تو اخلاقی قدروں کا اعتبار کہاں سے رہ جاتا۔ مذہب کا واسطہ غیب سے تھا اس کی بنیاد اُخروی جزا و سزا پر تھی اور جدید انکشافات نے غیب سے

انسان کا رشتہ توڑ کر اس کی فکر کا سنگ بنیاد مشاہدات و تجربات پر رکھ دیا تھا اور یہ تاریخ کی ایک تلخ حقیقت ہے کہ جب مذہب والوں کا مترو حد سے بڑھ جاتا ہے تو باغیوں کے انقلابات بھی محدود نہیں رہ سکتے۔

چنانچہ فسطائیوں نے بھی خدا کا انکار اسی بنیاد پر کیا تھا اور ہر مذہب میں شک کا ایک پہلو دوسرے پہلو کو متاثر کئے بغیر نہیں رہ سکا۔ اب مغرب کا یہ عالم ہو گیا تھا کہ مذہبی پابندیاں ختم ہو چکی تھیں اور ہر شخص اپنے تصرفات میں خود مختار بن چکا تھا۔ انسان کھلی فضا اور آزاد ہوا میں سانس لے رہا تھا۔ اور حدود و قیود کی دنیا کا سلسلہ ٹوٹ چکا تھا۔ انہیں حالات میں فکری و شخصی آزادی کا تصور منظر عام پر آیا، فکری آزادی علمی انقلاب کے نتیجہ میں پیدا ہوئی جہاں قدیم مسلمات نذر شک ہو چکے تھے۔ نہ کوئی ایسی حقیقت رہ گئی تھی جو ناقابل انکار ہو اور نہ کوئی ایسا مسلمہ رہ گیا تھا جس میں شبہ نہ کیا جا سکے۔ شخصی آزادی فکری دنیا کے انقلاب کے ردعمل کے طور پر پیدا ہوئی کہ جب اخلاقی اقدار اور روحانی انکار مشکوک و بیکار ہو چکے ہیں تو اب ہر شخص کو اپنے اعمال و افعال میں خود مختار ہونا چاہئے اور اس پر کوئی فوقانی پابندی عائد نہ ہونی چاہئے۔

یہیں سے اقتصادی آزادی کی بنیاد پڑ گئی جو آزادی کے سلسلے کی تیسری کڑی تھی۔ تازہ فکر انسان نے جب شخصی آزادی کی بنیاد ڈالی اور اسی آزادی پر نئی قدروں کی عمارت قائم کرنا شروع کر کے حیات و کائنات پر جدید نظر ڈالی تو اسے زندگانی دنیاوی لذت و راحت کے حصول کا بہترین ذریعہ دکھائی دیا اور اس نے یہ طے کر لیا کہ یہ لذت و راحت بغیر مال کے حاصل نہیں ہو سکتی، لہٰذا مال ہی وہ جادو کی کنجی ہے جس سے ہر قفل لذت کھولا جا سکتا ہے اور یہی وہ اعلیٰ وسیلہ ہے جس کے ذریعہ جدید طرز کا انسان لطف اندوز ہو سکتا ہے۔ اس لئے اقتصادی آزادی بھی انتہائی ضروری شے ہے۔ یہیں سے یہ خیال آیا تھا کہ جدید صنم یعنی مال کے تمام راستے کھل گئے۔ اور اس راہ کی ہر قربانی ایک شریف و بابرکت عمل بن گئی۔ اب جیسے جیسے روحانی اور فکری مفروضات میدان سے ہٹتے رہے ویسے ویسے

اقتصادیات کو اہمیت ملتی رہی۔ یہاں تک کہ مغربی معاشرہ میں ایک ایسا دور بھی آ گیا جب مارکسیت کو یہ خیال ہوگیا کہ اقتصاد ہی انسانی تاریخ کے ہر دور کا واقعی محرک ہے اور ظاہر ہے کہ اقتصادی آزادی بغیر سیاسی آزادی کے مکمل نہیں ہوسکتی تھی، اقتصادی خواہشات کی تحصیل کے لئے یہ ضروری تھا کہ انسان کو سیاسی طور پر مکمل آزادی حاصل ہو اور حکومت ارباب اقتصاد کے سامنے رکاوٹیں نہ پیدا کر سکے۔ اس لئے آزادی کے سلسلے کی چوتھی کڑی بھی ضروری قرار پا گئی اور اس طرح مغربی معاشرے کی آزادی کے چاروں ارکان مکمل ہو گئے۔ اور یہ بات واضح ہوگئی کہ مغربی معاشرے میں آزادی کا سلسلہ علمی دنیا کے شک سے شروع ہوا ہے۔ جس کی انتہا آزادی پر ایمان وعقیدہ کی منزل تک پہنچ گئی ہے۔ وہاں کا آزادی کا مفہوم مثبت ہے یعنی ہر انسان اپنے نفس کا مختار ہے۔ اسے کوئی قوت دبا نہیں سکتی۔ اس کا اختیار صرف اسی حد تک نہیں ہے کہ اس پر غیروں کا تسلط نہ ہے بلکہ وہ اس حد تک خودمختار رہے کہ اپنے نفس کا باقاعدہ مالک بنا رہے اور خدا اور آخرت سے اس کا رشتہ ٹوٹ جائے۔

اسلام کی آزادی اس سے بالکل مختلف ہے وہ آزادی کے منفی مفہوم کا حامل ہے اس کی نظر میں آزادی ایک انقلابی مفہوم ہے جس میں انسان غیر کے تسلط سے آزاد ہو جاتا ہے اور اس کے ہاتھ قید و بند سے کھل جاتے ہیں۔ یہی اس کا اعلیٰ مقصد اور عمدہ ہدف ہے۔

ارشاد ہوتا ہے کہ ہمارا رسولؐ لوگوں سے قدیم جکڑ بند کو مٹانے کے لئے آیا ہے۔[1]

لیکن اس کا مطلب مغربی قسم کی آزادی نہیں ہے یعنی اسلام اس آزادی کو نفس کی خودمختاری کا نتیجہ نہیں سمجھتا بلکہ اللہ کی عبودیت اور بندگی کا نتیجہ سمجھتا ہے وہ سارے انسانوں کو ایک صف میں اس لئے نہیں کھڑا کرتا کہ سب خودمختار اور آزاد ہیں بلکہ اس لئے کھڑا کرتا ہے کہ سب ایک خدا کے بندے ہیں اور کسی کو دوسرے پر دباؤ کا حق نہیں ہے یہاں تک کہ

---

[1] سورۂ اعراف: ۱۵۶

خود اس کے خواہشات بھی اسے مجبور نہیں کر سکتے........اسلام میں آزادی کی بنیاد اللہ کی خالص بندگی پر ہے جس کے آگے وہ تمام بت توڑ دینے کے قابل ہیں جو انسانی شرافت کی قربانی چاہتے ہیں اور جنہوں نے ہمیشہ اس کی عظمت کو بھینٹ چڑھایا ہے۔

اے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اہل کتاب سے کہو کہ آؤ ہم سب ایک اعتدالی کلمہ پر اتفاق کر لیں صرف خدا کی عبادت کریں کسی کو اس کا شریک نہ بنائیں اور نہ آپس میں ایک دوسرے کی ربوبیت کا اعتراف کریں۔[۱]

کیا تم لوگ اپنے ہاتھ کے تراشے ہوئے بتوں کی پرستش کرتے ہو جبکہ خدا نے تمہیں اور ان بتوں کو دونوں ہی کو پیدا کیا ہے۔[۲]

خدا کے علاوہ جنہیں بھی بلاتے ہو وہ سب تمہی جیسے بندے ہیں۔[۳]

قید خانے والو، یہ بتاؤ کہ ایک خدائے واحد وقہار اچھا ہے یا متفرق قسم کے خدا؟[۴]

یہی وہ طریقہ تھا جس سے اسلام نے آزادی کی تعلیم دی اور یہ بتایا کہ اللہ کی بندگی ہی تمام حریتوں کی بنیاد اور جملہ آزادیوں کی جڑ ہے اللہ کی خالص بندگی کے معنی یہ ہیں کہ انسان کسی غیر کے سامنے سر نہ جھکائے اور کائنات کی کسی شے سے مرعوب نہ ہو۔سب کو اپنے خالق کی مخلوق اور برابر کی سطح کی چیز تصور کرے۔اسلام اور مغرب کی حریت میں یہ بات مشترک ضرور ہے کہ دونوں انسان کو آزادی دلانا چاہتے ہیں لیکن اس کے بعد بھی اس

---

[۱] سورۂ آل عمران: ٦٤

[۲] سورۂ صافات ٩٥-٩٦

[۳] سورۂ اعراف: ١٩٢

[۴] سورۂ یوسف: ٣٩

کی بنیادوں میں زمین وآسمان کا فرق ہے۔ اسلام کی بنیاد عبودیت اور ایمان ہے اور مغرب کی بنیاد اپنے اوپر اعتماد اور خودرائی۔

اسلام میں اقدار و افکار کا احترام ہے اور مغرب میں سب کی تشکیک اور سب کا انکار۔ یہی وجہ ہے کہ اسلامی حریت کی بازگشت عقیدۂ توحید کی طرف ہوجاتی ہے اور جتنا انسان کے ذہن میں یہ عقیدہ پختہ اور خیال مستحکم ہوتا ہے اتنا ہی اس کا نفس بلند اور اس کا احساس پاکیزہ ہوتا ہے وہ اطمینان وسرکشی، بغاوت و استحصال کی مخالفت کرسکتا ہے اور دنیا کی کسی شے سے مرعوب نہیں ہوسکتا۔

صاحبان ایمان تک جب بغاوت پہنچتی ہے تو وہ فاتح ہوتے ہیں۔[1]

اسی کے برخلاف مغرب کی حریت ہے جس میں شک وشبہ کے علاوہ کچھ نہیں ہے اور جس کی بنیاد انتہائی کھوکھلی ہے۔ اس کا فلسفہ مدہوشی اور اس کی اصل خودرائی اور خود پرستی ہے۔ ایسی حریت کا اسلامی حریت سے موازنہ کرنے کے لئے ہمیں دو مقامات پر بحث کرنا پڑے گی، ایک کا نام انفرادی حریت ہوگا جس کا نام ہم نے شخصی حریت رکھا ہے اور ایک کا نام اجتماعی حریت ہے جس کے دائرے میں فکری، سیاسی اور اقتصادی تینوں قسم کی آزادیاں شامل ہوجاتی ہیں۔

شخصی حریت انسان کے انفرادی سلوک کا فیصلہ کرتی ہے اور اجتماعی حریت اسے معاشرہ کی ایک فرد سمجھ کر اس کے سلوک کا فیصلہ کرتی ہے جہاں اسے یہ اختیار دے دیا جاتا ہے کہ وہ جس طرح چاہے سوچے اور جس طرح چاہے اپنے افکار کا اعلان کرے جسے چاہے حاکم بنائے اور جسے چاہے معزول کردے انداز سے چاہے دولت جمع کرے اور جس انداز سے چاہے صرف کرے۔

---

[1] سورۂ شوریٰ:۳۹

شخصی حریت

مغربی تمدن کی ہمیشہ یہ خواہش رہی ہے کہ انسان کو اپنے سلوک وطریقہ کار میں زیادہ سے زیادہ آزادی دلائی جائے اس کی آزادی پر اس وقت تک کوئی پابندی نہ لگائی جائے جب تک اس آزادی سے دوسرے افراد مرعوب متاثر نہ ہوں اس کی نظر میں اس آزادی کے طریقہ استعمال اور اس سے پیدا ہونے والے نتائج کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ اس کا مقصد صرف افراد کو اپنے تصرفات میں آزاد کرا دینا اور اپنے ارادوں میں خودمختار بنا دینا ہے، اس کے نزدیک شرابی کتنی ہی شراب کیوں نہ پی جائے اور اس کی عقل کسی حد تک کیوں نہ معطل ہو جائے کوئی حرج ومضائقہ نہیں ہے اس لئے کہ وہ اپنے اختیارات کو صرف کر رہا ہے اور دوسروں کو نقصان نہیں پہنچا رہا ہے۔

یہی نغمہ تھا جس نے انسانیت کو مست و مدہوش کر دیا اور انسان ایک عرصہ تک یہ سوچتا رہ گیا کہ مغربی تہذیب نے سب سے پہلے دنیا کو جکڑ بند سے رہائی دلائی ہے اور وہ اس کے زیر سایہ پہلے پہل ہزارہا سال کی دبی ہوئی سانسوں کو ابھارنے کے قابل بنا ہے اب اسے روشنی میں کام کرنے کا اختیار مل گیا ہے اور اس کے سر سے تمام اضطرابات ہٹ گئے ہیں۔

لیکن افسوس کہ یہ شیریں خواب زیادہ دیر تک نہ رہ سکا اور انسان دھیرے دھیرے بیدار ہونے لگا۔ اسے یہ محسوس ہونے لگا کہ جیسے یہ آزادی خود ایک مستقل قید ہے اور اس حریت نے اس کی تمام امیدوں پر پانی پھیر دیا ہے وہ ایک گاڑی میں جوت دیا گیا ہے اور اسی کے ساتھ بندھا چلا جا رہا ہے نہ اس کو راستہ بدلنے کا اختیار ہے اور نہ ٹھہرنے کا۔

اس کی تسکین کا کل سامان یہ کلمہ ہے کہ "یہ گاڑی آزادی کی گاڑی ہے" اور یہ قید و بند حریت کی دوسری تعبیر ہے۔

سوال صرف یہ ہے کہ آزادی قید و بند اور حریت پابندی کیونکر بن گئی اور انسان کو یہ احساس کیونکر پیدا ہو گیا کہ وہ ایک گاڑی میں بندھا کھینچتا چلا جا رہا ہے؟

درحقیقت یہی وہ بات ہے جسے اسلام نے چودہ صدی قبل محسوس کیا تھا اور انسان کو اس نے ایسی کھوکھلی آزادی سے روک دیا تھا جس کے تجربات میں پابندیوں کا سامنا کرنا پڑے اور جو مقام عمل میں مشغول و مفلوج ہو جائے اس نے حریت کا نہایت عمیق تصور اور آزادی کا بڑا ابلیغ خیال پیش کیا تھا اس کا مطلب یہ تھا کہ انسان صرف ظاہری قید و بند سے آزاد نہ ہو بلکہ نفسانی فکریاتی پابندیوں سے بھی آزاد ہو جائے۔ اس کی آزادی تاریخ کی تمام آزادیوں سے زیادہ پاکیزہ اور اس کی حریت دنیا کی تمام حریتوں سے زیادہ بلند ہو۔ وہ یہ نہیں چاہتا تھا کہ مغرب کی طرح انسانی تمدن کا آغاز حریت و آزادی سے ہو اور انجام کار عبودیت پابندی اور قید و بند کا شکار ہو جائے بلکہ اس کا مقصد یہ تھا کہ آغاز کار عبودیت، بندگی اور ایمان سے ہو اور انجام میں جملہ پابندیوں سے آزادی مل جائے۔

اسلام نے انسانی آزادی کا کام خود اس کے داخل سے شروع کیا ہے اس کی نظر میں حریت کے معنی صرف یہ نہیں ہیں کہ کسی آدمی سے کہہ دیا جائے کہ راستہ کھلا ہوا ہے تشریف لے جایئے، بلکہ حریت کا حقیقی مفہوم یہ ہے کہ انسان اپنے اختیارات کو ختم کرے سفر میں ہوش و حواس کو سلامت رکھے اور اپنے طرز عمل کو فکر و نظر کی روشنی میں معین کرے اور یہ کام ہے جس کے لئے سب سے پہلے خواہشات سے آزاد ہونا پڑے گا تا کہ خواہش خود ایک تنبیہ بن جائے اور ارادہ پر قابو نہ پا سکے خواہش کے ارادہ پر غلبہ کا مقصد حریت کی موت اور آزادی کی تباہی ہے۔

اس میں کوئی شرف نہیں ہے کہ انسان کے ہاتھ کھلے رہیں اور اس کی عقل پر خواہشات مسلط رہیں۔ حقیقی شرف یہ ہے کہ ہاتھوں کی طرح عقل و فکر بھی خواہش کے حدود و

قیود سے آزاد ہے اور انسان حیوانات سے الگ ایک مخلوق معلوم ہو اور ظاہر ہے کہ انسان اور حیوان میں امتیاز کی جہت صرف عقل وخواہش کا متوازی اقتدار ہے۔ خواہش عقل پر غالب آجائے تو حیوانیت ہے اور عقل خواہش پر قابو پالے تو انسانیت ورنہ ارادہ واختیار سے تصرف تو دونوں ہی کے یہاں ہوتا ہے اس میں انسان ہی کی کیا خصوصیت ہے۔ انسان کا امتیاز تو اسی طاقت میں ہے کہ وہ خواہش کو عقل پر غالب نہ آنے دے اس لئے اگر ہم نے ظاہری آزادی پر اکتفا کر لیا اور اسے آزاد بنا کر اس کے سامنے تمام خواہشات کو ابھارنے والے عناصر رکھ دیئے تو یہ اس کی آزادی نہ ہوگی بلکہ رفتہ رفتہ آزادی کی بربادی ہوگی اور انسانیت کی تباہی جیسا کہ مغربی تمدن نے کیا۔ اس نے انسان کو خواہشات کا تابع بنا کر اپنے افعال میں یوں خودمختار بنا دیا ہے کہ درمیان راہ میں ایک مرتبہ اسے یہ احساس ہونے لگتا ہے کہ وہ حقیقتاً اپنے ارادے پر حاکم نہیں ہے بلکہ اپنی خواہشات کا محکوم ہے۔ اسلام نے اسی نکتہ کو پیش نظر رکھتے ہوئے پہلے انسان کے نفس کو مضبوط بنایا، اس کی پرورش کی، اسے غذائیں مہیا کیں اس کی انسانی تربیت کی اور اسے حیوانیت سے الگ کیا۔ اس کے ذہن میں یہ نکتہ راسخ بنایا کہ تیری شان خواہشات کے ساتھ بہنا نہیں ہے بلکہ تیرا فریضہ اعلیٰ قدروں کے لئے سعی وکوشش اور بلند مقاصد کے لئے جدوجہد کرنا ہے خواہشات کی پابندی تیری عظمت کے خلاف اور شہوتوں کا اتباع تیری حیثیت کے منافی ہے۔ تیرے ہاتھ ہر وقت کھلے رہنے چاہئیں اور تیرے اقدامات عقل وفکر کی روشنی میں ہونے چاہئیں۔ ایسا نہ ہو کہ تو اپنے اعمال وافکار میں ہاں اور نہیں سے بھی محروم ہو جائے اور خواہشات کے آگے تیرا منہ کھلا کا کھلا رہ جائے۔

قرآن حکیم نے روحانیت کی اعلیٰ تعلیم سے یہی مقصد حاصل کرنا چاہا تھا وہ یہی چاہتا تھا کہ انسان زمین کے پست مقاصد کو نظرانداز کر کے وسیع فضا پر نظر کرے اور بلند مقاصد کے لئے رفتارِ عمل کو تیز تر کر دے۔

ارشاد ہوتا ہے لوگوں کے لئے مختلف خواہشات عورت، اولاد،

سونے اور چاندی کے ڈھیر، نشان زدہ گھوڑے، جانور، زراعت کی محبت آراستہ ہوگئی ہے حالانکہ یہ سب دنیا کی متاع ہے اور اللہ کے یہاں بہترین محل ومکان ہے۔۔اے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کہہ دو کہ کیا میں تمہیں اس سے بہتر چیز بتاؤں؟ یادرکھو کہ صاحبان تقویٰ کے لئے اللہ کے پاس وہ جنتیں ہیں جن کے نیچے نہریں جاری ہیں وہ ان میں ہمیشہ رہیں گے ان کے لئے پاکیزہ بیویاں اور اللہ کی رضا مہیا ہے اور خداتو اپنے بندوں کوخوب جانتا ہے۔''[1]

یہ ہے درحقیقت انسان کے باطن کی آزادی جس کے بغیر ہر لفظ آزادی کھوکھلا اور ہر تصور حریت بے معنی ہے۔اسلامی حریت کی بنیاد یہی تطہیر نفس ہے جس میں خواہشات کے خلاف عظیم محاذ قائم کیا گیا ہے اور اس کے علاوہ ہر شئے کو قید وبند تصور کیا گیا ہے۔قرآن کی اس آیت کا گہرا مطالعہ بھی اس بات کو واضح کرتا ہے کہ یہاں بھی اسلام نے خواہشات سے آزادی اور نفس کی تطہیر کے لئے وہی طریقہ استعمال کیا ہے جو اس نے دیگر مقامات پر تطہیر نفس کے لئے استعمال کیا تھا، یعنی طریقۂ توحید..........وہ جب انسان کو زمین اور اس کی لذتوں سے بے نیاز بناتا ہے تو اسی کے ساتھ ساتھ آسمان اور اس کی جنتوں سے روشناس بھی کراتا ہے۔اللہ کی رضا مندی کی پیشکش کرتا ہے، اس لئے کہ توحید ہی داخلی آزادی کی سند اور خارجی آزادی کا وسیلہ ہے۔

ہم اس مقام پر ایک ہی مثال پیش کریں گے جس سے داخلی آزادی کا مفہوم واضح ہوجائے اور قرآن کی پیش کی ہوئی آزادی کا مغربی آزادی سے تفرقہ بھی ہوجائے گا اور وہ یہ مثال ہے ''شراب'' قرآن حکیم نے اپنی تربیت کے اعتماد پر اتنی قوت پیدا کر لی تھی کہ اپنی امت سے ایک دفعہ یہ کہہ کر شراب نہیں.............اور شراب اس کے لغت سے محو ہوجائے۔اس لئے کہ امت اپنے ارادے پر مسلط اور اپنی خواہشات پر غالب تھی

---

[1] سورۂ آل عمران: ۱۴۔۱۵

یعنی حقیقی حریت سے بہرہ اندوز تھی۔ برخلاف مغربی تمدن کے کہ وہاں ظاہری حریت کا ڈھنڈورا پیٹنے کے باوجود کسی کو اپنے ارادے پر اختیار نہیں ہے اور ہر شخص خواہش کے دھارے پر بہہ رہا ہے اور یہی وجہ ہے کہ امریکی قوم کا کوئی شخص بھی حقیقی حریت کے مفہوم سے آشنا نہ تھا وہ صرف آزادی کے لفظ کو پہنچانتا تھا اس لئے وہاں کے نظام میں نہیں کہنے کی قوت ہی نہ تھی اور نہ وہ اس نہیں پر عمل کرنے کے قابل تھا۔

اسلام کی نظر میں یہی داخلی حریت اور تہذیب نفس اجتماعی قلعے کی تعمیر میں سنگ بنیاد کی حیثیت رکھتی ہے اس کا خیال ہے کہ جب تک لوگ اپنے ارادے کے مختار نہ ہونگے اور ان میں خواہشات کے مقابلے میں اخلاقی اور روحانی اقدار کے تحفظ کا جذبہ نہ ہوگا اس وقت تک کوئی اعلیٰ معاشرہ وجود میں نہیں آسکتا اور نہ اس معاشرہ کو حقیقی طور سے آزاد کہا جا سکتا ہے۔

ارشاد ہوتا ہے

''خدا اس وقت تک قومی حالات کو نہیں بدلتا جب تک لوگ اپنے انفرادی حالات کو نہ بدل لیں''[۱]

جب ہم کسی قریے کو ہلاک کرنا چاہتے ہیں تو اس کے دولت مندوں پر احکام نازل کرتے ہیں وہ ان کی مخالفت کرتے ہیں ہماری حجت تمام ہو جاتی ہے اور ہم انہیں تباہ و برباد کر دیتے ہیں۔''[۲]

---

[۱] سورۂ رعد:۱۱

[۲] سورۂ الاسرٰ:۱۶

اجتماعی حریت

اسلام نے جس طرح شخصی آزادی کے میدان میں داخلی حریت کا اہتمام کیا ہے اسی طرح اجتماعی میدان میں بھی ایک انقلابی قدم اٹھایا ہے اس کا مقصد یہ ہے کہ انفرادی آزادی کے میدان میں خواہش کے بتوں کو توڑ دیا جائے اور اجتماعی آزادی کے میدان میں اجتماعی بتوں کو توڑ کر انسان کو انسان پرستی سے آزاد کر دیا جائے۔

اس کا اعلان ہے

''اے اہل کتاب آؤ ہم تم ایک درمیانی کلمہ پر اتفاق کر لیں
سب مل کر ایک خدا کی عبادت کریں شرک کو چھوڑ دیں اور آپس میں
ایک دوسرے کو خدا نہ بنائیں۔''

خدا کی بندگی ہی وہ ہے جو پورے عالم انسانیت کو ایک سطح پر لا سکتی ہے بندگی کے بعد سب ایک منزل پر آ جاتے ہیں اور کسی کو دوسرے کے استحصال کا حق نہیں ہوتا، نہ فرد فرد کو دبا سکتا ہے اور نہ جماعت جماعت کو۔

اسلام نے معاشرتی معرکہ میں بھی وہی طریقہ استعمال کیا ہے جس سے داخلی معرکہ میں مدد لی تھی یعنی یہاں بھی طریقہ توحید ہی کو اپنایا ہے۔ اس کا اعلان ہے کہ ایک خدا کی بندگی کرو اور ہر پرستش سے جدا ہو جاؤ۔ دنیا کی کسی قوت یا سماج کے کسی بت کے سامنے ذلت کا احساس نہ کرو تمہارے ذہن میں یہی رہنا چاہئے کہ سب ایک خالق کی مخلوق اور سب ایک حاکم کے محکوم ہیں۔

انسانی زندگی میں بت پرستی کا درود دو وجھوں سے ہوا کرتا ہے کبھی انسان خواہش پرستی کی بنیاد پر مجبور ہوجاتا ہے کہ اپنی حریت اور خودداری کو قربان کر کے کسی انسان صنم کی پرستش کرے اوراس طرح اپنی خواہش کی تسکین کا سامان مہیا کرے۔اور کبھی ان بتوں کی پرستش کے نتائج سے بے خبر ہو کر ان کی پوجا کرنے لگتا ہے۔ اسلام نے ایک طرف خواہشات کے اتباع کو روک کر پہلی کڑی کو توڑا اور دوسری طرف ان انسانوں کی پرستش کے نتائج کا اعلان کیا۔

''خدا کے علاوہ ان کو بلاتے ہو وہ خود بھی تمہاری طرح کے بندے ہیں''

اسلام کی انہیں بنیادوں کی روشنی میں جن کے ذریعے اس نے انفرادی میدان میں خواہشات کی بندگی اور اجتماعی میدان میں صنم پرستی سے آزادی دلائی ہے یہ اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ اسلام میں شخصی حریت کی حدود و قیود کیا ہیں۔ یہ اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ اسلام میں شخصی حریت کی حدود قیود کیا ہیں؟ اور انسان اپنے ذاتی اعمال وافعال میں کس حد تک آزاد ہے؟ اور وہ اس طرح کہ مغرب میں شخصی آزادی کی آخری حدود سرمایہ کی آزادی کو قرار دیا گیا ہے وہاں انسان اپنے ذاتی اعمال میں اس وقت تک آزاد رہتا ہے جب تک کہ اس کی آزادی سے دوسرے افراد متاثر نہ ہوں،لیکن اسلام اس سے بالکل مختلف ہے اس کی آزادی کی بنیاد دوسرے افراد یا ان کی آزادی نہیں ہے بلکہ اس نے آزادی کا سنگ بنیاد انسان کے داخل میں رکھا ہے۔اس کی نظر میں آزادی کا صحیح مفہوم خواہشات کی بندگی سے آزادی ہے اس لئے ذاتی اعمال کے میدان میں بھی انسان وہیں تک آزاد رہ سکتا ہے جہاں تک اس کی بندگی اور توحید متاثر نہ ہو۔

''تمہارے لئے زمین کی ہر شئے کو پیدا کیا گیا ہے''۔[1]

''تمہارے لئے زمین وآسمان کی ہر شئے کو مسخر کر دیا گیا

---

[1] سورۂ البقرہ:۲۹

ہے''۔[1]

یعنی ہر شئے تمہارے زیر تصرف اور ہر موجود تمہارے زیر اختیار ہے، لیکن شرط یہی ہے کہ جذبات وخواہشات کی پابندی نہ ہو اور صنم پرستی کا شائبہ نہ پیدا ہونے پائے۔ اس لئے کہ یہ چیز اسلام کی حقیقی حریت کے منافی اور اس کے عقیدہ توحید سے متصادم ہے۔ اس میں حریت کے گہرے معانی کی تباہی اور انسان کی واقعی عظمت کا خون ہے۔حریت حیوانی خواہشات کی آزادی کا نام نہیں ہے بلکہ انسانی نظام کے ایک اہم فکری اور روحانی جز کا نام ہے۔

یہ یاد رکھنے کی بات ہے کہ اسلام کی معاشرتی حریت بھی اپنے واقع کے اعتبار سے مغرب کی حریت سے متفق نہیں ہے، بلکہ شخصی حریت کی طرح یہ حریت بھی ایک خاص مفہوم اور چند مخصوص حدود وقیود کی پابند ہے..........مغرب میں سیاسی حریت کے معنی انسان کی خودمختاری اور غیر کے تسلط کی نفی کے ہیں، اس لئے کہ اس کی بنیاد افراد کی باہمی مساوات پر ہے اور اس کا خیال ہے کہ جب قوانین تمام افراد معاشرہ پر نافذ ہوتے ہیں اور احکام کا اتباع سب کو کرنا پڑتا ہے تو قانون سازی کا اختیار بھی سب ہی کو ہونا چاہئے ایک آدمی کے قانون کو دوسرے پر بار کرنا ظلم اور ناانصافی ہے، لیکن ظاہر ہے کہ یہ فکر کبھی حقیقت کا جامہ نہیں پہن سکتی تھی، اس لئے عملی میدان میں ایک تناقص کا شکار ہوگئی۔حریت کا خیال تھا کہ سب کو مساوی اور برابر ہونا چاہئے اور سب کی رائے کا احترام ہونا چاہئے اور رائے کا یہ حال ہے کہ ہر شخص ایک الگ مزاج الگ ذہن اور الگ دماغ رکھتا ہے، ایک دوسرے کے خیال کا پابند نہیں ہوسکتا۔اس لئے ہر ایک کی رائے کی بنیاد پر کوئی قانون نہیں بن سکتا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اکثریت کا قانون وضع کیا گیا اور یہ طے پایا کہ اختلافی صورتوں میں فیصلہ اکثریت کے قول کے مطابق کیا جائے حالانکہ یہ بات حقیقی حریت کی سراسر موت تھی اور اس میں اقلیت کی رائے کا پامال ہونا ناگزیر تھا۔

---

[1] سورۂ جاثیہ: ۱۳

یہ ممکن ہے کہ اقلیت بھی اکثریت کی رائے کے احترام پر بنیادی طور پر اتفاق کر لے لیکن یہ بہر حال طے ہے کہ اس کا اپنا ذاتی خیال بھی ہوتا ہے جس کی ترویج کے لئے مواقع کی تلاش میں رہتی ہے اور ایک وقت وہ آجاتا ہے جب اقلیت اکثریت کی شکل اختیار کر لیتی ہے اور حکومت کا طرز بدل جاتا ہے۔ علاوہ اس کے کہ تمام معاشروں میں ایسا بھی نہیں ہے بلکہ بہت سے معاشرے ایسے بھی ہیں جہاں اقلیت اپنے علاوہ کسی کی رائے کو قبول کرنے پر تیار نہیں ہے اور نہ اس کی نظر میں اکثریت کا فیصلہ اس کی صحت کا ضامن ہے۔

مقصد یہ ہے کہ مغربی معاشرہ کی سیاسی آزادی خیالی دنیا میں تو کامیاب ہوسکتی ہے لیکن عملی میدان میں اس کے وجود پیدا کر لینے کا کوئی امکان نہیں ہے اور اس میدان میں یہ حریت اکثریت کے بت کی پوجا کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ جس سے اسلام کو سو فیصدی اختلاف ہے اس کا نظریہ یہ ہے کہ سارے انسان ایک خدا کے بندے ہیں اور وہی خدا انسانی زندگی کے دستور کی ترتیب کا حق رکھتا ہے، اس کے علاوہ انسان کو خود کوئی اختیار نہیں ہے اس کا کام صرف اتباع کرنا ہے اور بس!

''کیا متفرق خدا ایک خدائے واحد وقہار سے بہتر ہیں؟ حکم کا حق صرف خدا کو ہے اس کا حکم ہے کہ تم سب صرف اسی کی عبادت کیا کرو۔''[۱]

لوگوں نے اپنے علما اور راہبوں کو خدا بنالیا ہے اور خدا کو چھوڑ دیا ہے۔[۲]

اس انداز کی سخت تنقید اس بات کی واضح دلیل ہے کہ اسلام انسان کی حکومت انسان پر برداشت نہیں کرسکتا اس کی نظر میں انسانی بت کی پرستش کسی حال میں بھی روا نہیں ہے۔ اس لئے کہ اس نے سیاسی آزادی توحید اور بندگی کی بنیاد پر دی ہے وہ مسئولیت کا

---

[۱] سورۂ یوسف: ۳۹۔۴۰

[۲] سورۂ توبہ: ۳۱

بار بیک وقت تمام افراد کی گردن پر رکھنا چاہتا ہے۔

''تم سب کے سب نگران ہو اور تم سے اپنی اپنی رعایا کے بارے میں سوال کیا جائے''

یعنی مغرب کی سیاسی آزادی حکومت سازی اور قانون سازی کے معنی میں ہے اور اسلام میں سیاسی آزادی امانتداری اور ذمہ داری کے میدان میں مساوات کے معنی میں ہے جو سیاسی میدان میں دوسروں کے قانون کی پابندی سے آزاد کرا دیتی ہے اور کسی فرد یا جماعت کے تسلط کو برداشت نہیں کرسکتی۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم نے فرعون اور اس کے تسلط کی بے حد مذمت کی ہے اس کا کہنا ہے کہ۔

''فرعون زمین میں بلند ہوا، اس نے لوگوں کو چند ٹکڑوں میں بانٹ دیا اور ایک جماعت کو کمزور بنا دیا۔''[1]

اور یہ طریقہ کار اسلامی اصولوں کے خلاف ہے اس کی نظر میں کسی فرد یا جماعت یا طبقہ کا غلبہ سراسر ظلم اور ناانصافی ہے۔ اس طرح انسان ایک سطح پر نہیں آسکتے اور سب بندگی کی سرزمین پر نہیں کھڑے ہو سکتے۔

اقتصادی آزادی بھی سرمایہ دارانہ تصور کے اعتبار سے ایک بالکل کھوکھلی آزادی ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ اقتصادی میدان میں ہر شخص آزاد ہے جس طرح چاہے کسب معاش کرے، حکومت کوئی دخل اندازی نہ کرے گی۔ یعنی حکومت کا موقف منفی ہے وہ سکوت کی پالیسی پر عمل کرے گی اس سے کسی مثبت عمل کی توقع بیکار ہے وہ اس امر کی ذمہ دار نہیں ہے کہ افراد کے لئے اسباب و وسائل بھی مہیا کرے یہ ان کا اپنا ذاتی فرض ہے جس کی کوئی مسئولیت حکومت کے ذمہ نہیں ہے............ یہی وجہ ہے کہ اس آزادی میں ان لوگوں کا کوئی حصہ نہیں ہے جو مقدر کی خرابی سے وسائل سے عاری ہیں اور اقتصادی دوڑ میں دوسرے لوگوں کے ساتھ دوڑنے کے قابل نہیں ہیں۔ ان کے حق میں یہ آزادی صرف ایک

---

[1] سورۂ قصص: ۴

ڈھونگ ہے اور کچھ نہیں.......... ان کے لئے تو اس آزادی کا یہی مفہوم ہے کہ تیراکی کے فن سے ناواقف اور ہاتھ پاؤں سے بیکار افراد کو دریا میں ڈال کر ان سے کہہ دیا جائے کہ آپ کو تیرنے کی مکمل آزادی ہے جدھر چاہئے جا سکتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ وہ غریب کسی طرف بھی جانے کے قابل نہیں ہیں۔ انہیں اس آزادی سے کیا فائدہ؟ آزادی کا توصحیح تصور یہ تھا کہ ان کے لئے تیراکی کا انتظام کیا جاتا انہیں اس فن کا ماہر بنایا جاتا اور اس کے بعد دریا کے حوالے کیا جاتا، پھر ان کے پہلو بہ پہلو ایسے ماہرین بھی چلتے جو انہیں ڈوبتے وقت سہارا دے سکیں اور غرق ہونے سے بچا سکیں۔ اسلام کی آزادی کا یہی مفہوم ہے کہ اس نے حریت کے ساتھ ضمانت کا قانون وضع کر کے یہ واضح کر دیا کہ ہم میدان میں آگے بڑھنے کی اجازت بھی دیتے ہیں اور عاجز لوگوں کے آگے بڑھنے کی ضمانت بھی لیتے ہیں۔ ہمارے یہاں افراد کو اپنی آزادی کی قربانی دینی پڑے گی اگر ان کی آزادی سے دوسرے افراد کی زندگی متاثر ہوتی ہے اور ان کے معاشیات پامال ہو رہے ہیں۔

فکری حریت کا بھی مغربی تصور یہی ہے کہ ہر شخص کو سوچنے اور اپنی رائے کے اعلان کرنے کی عام اجازت ہے بشرطیکہ وہ رائے آزادی اور آزادی کے بنیادی افکار کو متاثر نہ کر سکے اور یہی وجہ ہے کہ ڈیموکریسی والے معاشرے فاشستی افکار کو عام نہیں ہونے دیتے کہ ان سے ان کے بنیادی خیالات پر اثر پڑتا ہے اور یہ افکار ان کی اصل عمارت ہی کو منہدم کر دیتے ہیں۔

اسلام یہاں بھی مغرب سے مکمل اختلاف رکھتا ہے اور اس اختلاف کی بنیاد بھی وہی فطری اختلاف ہے جو اسلام اور مغربیت میں پایا جاتا ہے کہ مغربیت انسان کو پیدائشی طور پر آزاد تسلیم کرتی ہے اور اسلام اسے ایک خالق کی مخلوق اور ایک خدا کا بندہ سمجھتا ہے، اس کی نظر میں ذاتی افکار کے اعلان پر اس وقت تک کوئی پابندی نہیں ہے جب تک عقیدہ توحید متاثر نہ ہو اور انسان اپنی شخصیت کو خواہشات واصنام کے حوالے نہ کر دے یا دوسرے الفاظ میں یوں سمجھ لیجئے کہ افکار کے اعلان پر دونوں ہی جگہ پابندی ہے اور پابندی

کی سرحدیں دونوں مقامات پر اپنے اپنے بنیادی افکار سے شروع ہوتی ہے۔

اسلام کی فکری آزادی کا ایک نمونہ یہ بھی ہے کہ اس نے اندھی تقلید کی شدید مخالفت کی ہے اور انسان کے اندر ایک استدلالی عقل اور منطقی ذہن پیدا کرنا چاہا ہے۔ اس کا عقیدہ یہ ہے کہ فکری آزادی صرف اس بات میں نہیں ہے کہ انسان کو ہر طرح سوچنے کا اختیار دے دیا جائے چاہے وہ نتیجہ میں خواہش پرستی اور اندھی تقلید ہی تک کیوں نہ کھینچ جائے، بلکہ حقیقی آزادی یہ ہے کہ فکر ونظر کی صلاحیت پیدا کی جائے استدلال ومنطق کا شعور پیدا کیا جائے۔ آبائی تقلید سے روکا جائے رسوم وعادات کی بے جا پابندی سے نجات دلائی جائے اورخواہش کے مقابلہ میں عقل کی بنیاد پر سوچنے کا عادی بنایا جائے۔ یہی آزادی کا انقلابی تصور اور یہی حریت کا حقیقی مفہوم ہے بیجا تقلید اور تعصب جیسے جذبات انسان کی آزادی فکر کو پامال کر دیتے ہیں ارشاد ہوتا ہے۔

> ''ہمارے ان بندوں کو بشارت دے دو جو بات کو غور سے سنتے ہیں اور پھر جو اچھی ہوتی ہے اس کا اتباع بھی کرتے ہیں، یہی وہ ہیں جن کی اللہ نے ہدایت کی ہے اور یہی وہ ہیں جو صاحبان عقل ہیں۔'' [۱]

> ''اے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہم نے آپ کی طرف ذکر نازل کیا تاکہ آپ لوگوں سے بیان کریں شاید وہ اس طرح فکر کرنے لگیں''۔ [۲]

> ''جب ان سے کہا جاتا ہے کہ خدائی تنزیل کا اتباع کرو تو یہ کہتے ہیں کہ ہم اپنے آبا واجداد کی سیرت پر چلتے ہیں۔

---

[۱] سورۂ الزمر: ۱۷۔۱۸

[۲] سورۂ النحل: ۴۴

چاہے ان کے آبا واجداد بے عقل وگمراہ رہے ہوں۔ [۱]

''یہ ان لوگوں کے خیالات ہیں۔ ان سے کہہ دو کہ اگر یہ سچے ہیں تو اپنے گواہ لے آئیں۔'' [۲]

۞۞۞۞۞۞

[۱] سورۂ بقرہ:۱۷۰

[۲] سورۂ بقرہ:۱۱۱

ضمانت

اسلام اور مارکس ازم میں

اسلامی نظام کی ضمانت مارکس ازم کی ضمانت سے کئی اعتبار سے اختلاف رکھتی ہے جس کی بنیاد اساس طریقہ کار اور مقصد کا اختلاف ہے تفصیل کا موقع نہیں ہے اس لئے صرف ایک خاکہ پر نظر کی جاتی ہے۔

﴿۱﴾ اساسی اختلاف کا مفہوم یہ ہے کہ اسلامی قانون میں ضمانت ایک انسانی حق ہے جو بندے کے سر اللہ کی طرف سے فرض کیا گیا ہے۔ اس میں نہ حالات سے فرق پیدا ہوسکتا ہے اور نہ تمدنی سطحوں سے ذرائع پیداوار کسی منزل پر ہوں اور حالات کیسے ہی کیوں نہ ہوں ہر انسان دوسرے انسان کی زندگی کا بقدر امکان ضامن ہے، برخلاف اشتراکیت کے کہ وہاں ضمانت کا تعلق ذرائع پیداوار سے ہے، یہ ذرائع اگر ایک خاص مقدار تک ترقی کر جائیں تو عام ضمانت کا قانون نافذ ہوگا ورنہ نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ یہ قانون اشتراکیت کے ہر معاشرہ میں رائج نہیں ہوا بلکہ بہت سے معاشرے اس سے عاری رہے ہیں۔

﴿۲﴾ اسلامی نظام میں اجتماعی ضمانت کے روا کا ذریعہ وہ احساس اخوت ہے جو پورے اسلامی معاشرے میں پایا جاتا ہے اور ہر ایک کو دوسرے کی زندگی کی

حفاظت کی دعوت دیتا ہے۔ حدیث میں ہے کہ

''مسلمان مسلمان کا بھائی ہے اس پر ظلم کرسکتا ہے نہ اسے ترک کرسکتا ہے اور نہ محروم رکھ سکتا ہے مسلمانوں کا فرض ہے کوشش کریں، تعلقات پیدا کریں ایک دوسرے کی مدد کریں اور اہل ضرورت سے ہمدردی کریں۔

لیکن مارکسیت میں اس کا واحد ذریعہ طبقاتی نزاع ہے جس کے بعد ایک طبقہ فنا ہوجائے گا اور دوسرا طبقہ برسر اقتدار آجائے گا اور ضمانت کا قانون خود بخود نافذ ہوجائے گا۔ نہ کسی اخوت کی ضرورت پڑے گی اور نہ مواسات و ہمدردی کی۔ اہل حکومت کا کام صرف یہ ہوگا کہ سماج کے ضعیف طبقہ کو قوی طبقہ سے ٹکرانے کے لئے تیار کریں اور اس نزاع کی رفتار کو تیز تر کردیں۔ تا کہ ضعیف طبقہ کی فتح کے بعد ضمانت کے اصول خود ہی سامنے آجائیں۔

﴿۳﴾ مقصد کے اعتبار سے دونوں کی ضمانت میں یہ فرق ہے کہ اسلامی دستور میں ضمانت ایک انسانی حق ہونے کے رشتے سے کسی ایک جماعت کے ساتھ مخصوص نہیں کی جاسکتی بلکہ یہ فائدہ ان لوگوں کو بھی پہنچے گا جو خود کسی پیداوار کے اہل نہیں ہیں اور معاشی تگ ودو میں معاشرے کے ساتھ چلنے کے قابل بھی نہیں ہیں۔ حکومت کا فرض ہے کہ ایسے لوگوں کی زندگی کی بھی ضمانت لے اور ان کے معاشیات کا بھی اہتمام کرے۔ لیکن مارکسیت میں ایسا کچھ نہیں ہے وہاں اصل طبقاتی نزاع ہے جس میں مزدور طبقہ کی فتح ہوگی، سرمایہ داری کا خاتمہ ہوگا اور تمام مزدوروں میں دولت حسب حصہ تقسیم کردی جائے گی۔ کسی کی ضمانت کا کوئی سوال ہی نہ پیدا ہوگا اور یہی وجہ ہے کہ مارکسیت میں ان عاجز افراد کی زندگی کی کوئی ضمانت نہیں ہے جو مزدور طبقہ سے الگ ہیں اور خود کوئی کام کرنے سے عاجز ہیں اس لئے کہ انہوں نے طبقاتی جہاد میں کوئی حصہ نہیں لیا ہے اور جس نے جہاد نہیں کیا ہے اسے مال غنیمت سے کیا سروکار؟

﴿۴﴾ مارکسیت کی نظر میں معاشرتی ضمانت کا قانون صرف حکومت کی ذمہ داری ہے، افراد سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ لیکن اسلام میں یہ افراد اور حکومت دونوں ہی کی ذمہ داری ہے اور یہی وجہ ہے کہ اس نے اس قانون کو دو حصوں پر تقسیم کر دیا ہے ایک کفالت اور ایک ضمانت۔

کفالت کا مطالب یہ ہے کہ مسلمانوں کی ہر فرد دوسرے افراد کی زندگی کا ذمہ دار ہے اور ایک مسلمان کے استطاعت رکھتے ہوئے دوسرے انسان کا فاقہ کرنا ناممکن ہے۔ حالات کتنے ہی ناگفتہ بہ کیوں نہ ہوجائیں۔ اس قانون کو بہرحال نافذ کرنا پڑے گا حکومت شرعیہ رہے یا نہ رہے خود افراد اس قانون پر عمل کرینگے۔

حدیث شریف میں اعلان ہوتا ہے کہ

جس مومن نے بھی دوسرے مومن کو استطاعت و امکان رکھتے ہوئے کوئی ضرورت کی چیز دینے سے انکار کر دیا اسے پروردگار روز قیامت اس طرح اٹھائے گا کہ چہرہ سیاہ آنکھیں نیلی اور ہاتھ پس گردن کے ساتھ بندھے ہوئے ہوں گے اور یہ کہا جائے گا کہ اس خائن نے اللہ و رسول کے ساتھ خیانت کی ہے لہٰذا اسے جہنم میں جھونک دیا جائے۔''

ضمانت کا مفہوم یہ ہے کہ حکومت سماج کی سطح کو بلند کرنے کی مکمل ذمہ دار ہے۔ اس کا فرض ہے کہ حکومت کی املاک کے مختلف ذرائع سے عوامی زندگی کی سطح کو بلند کرے اور اس میں کوئی کوتاہی نہ کرے

ارشاد ہوتا ہے کہ۔

''والی کا فرض یہ ہے کہ مال کو لے کر ان تمام وجود میں صرف کرے جنہیں پروردگار عالم نے معین کیا ہے فقرا

ومساکین و مولفتہ القلوب عاملین کو دے۔ غلاموں کی آزادی اورقرض داروں کی رہائی میں صرف کرے۔

فی سبیل اللہ تعمیری کام کرے۔غربت زدہ مسافروں کی امداد کرے۔اتنا دے کہ وہ لوگ سال بھر کے لئے مستغنی ہوجائیں۔اس میں کوئی تنگی اورتقیہ نہ کرے۔اس کے بعد اگر کچھ بچ جائے تو وہ والی کا ہے اوراگرکم پڑ جائے تو والی کی ذمہ داری ہے کہ اسے اپنے پاس سے پورا کرے یہاں تک کہ وہ لوگ مستغنی ہوجائیں۔

محمد باقرالصدر

النجف الاشرف

توضیحات مترجم

سرمایہ داری اور فلسفہ

مولف محترم نے اپنے بیانات میں اس بات کا دعویٰ کیا ہے کہ سرمایہ داری کا کوئی بنیادی فلسفہ نہیں ہے۔ اس عبارت کا مفہوم یہ ہے کہ کوئی نظام زندگی اس وقت تک نظام نہیں کہا جا سکتا جب تک اس میں حیات وکائنات کے بنیادی مسائل حل نہ کر لئے گئے ہوں۔

سرمایہ داری نے آزادی کی آواز ضرور بلند کی ہے لیکن انسان کی حقیقت حیات کی نوعیت اور تاریخ کی رفتار کے بارے میں کوئی فیصلہ نہیں کیا۔ اس کا نظریہ مادی ضرور ہے لیکن اس نے مادیت کے بارے میں بھی کوئی رائے ظاہر نہیں کی۔

سرمایہ داری اور اسلام کا ایک نمایاں فرق یہی ہے کہ سرمایہ داری نے مادیت کو اپنا کر حیات کے جملہ مسائل کو نظر انداز کر دیا ہے اور اسلام نے حیات کو ''خوردو و پودے'' کے بجائے ایک خالق و مالک کا عطیہ تسلیم کیا ہے۔

سرمایہ داری کی نظر میں آزادی انسان کا فطری حق ہے اور اسلام کی نظر میں مالک کا صدقہ وہ انسان کو ہمہ جہت آزاد دیکھنا چاہتی ہے اور یہ مالک کی رضا کا پابند ہے۔

اشتراکیت کو سرمایہ داری پر یہی فوقیت حاصل ہے کہ اس نے حیات وکائنات کے مسائل کو درخور اعتنا بنایا ہے اس کا خیال ہے کہ زندگی ایک شعلہ ہے جو از خود بھڑک اٹھتا ہے اور اپنی میعاد پوری کر کے بجھ جاتا ہے۔ وہ کسی خالق و مالک کی معترف نہیں ہے۔ اس

کے یہاں نہ کسی ابتدا کا تصور ہے اور نہ انتہا کا۔ وہ نہ مبدا کی قائل ہے اور نہ معاد کی۔

اس کا کہنا ہے کہ تاریخ کی رفتار ایک جدلیاتی کیفیت رکھتی ہے، ہر سماج اپنے اندر اپنے مخالف جراثیم رکھتا ہے جو دھیرے دھیرے پرورش پاتے رہتے ہیں اور ایک وقت پوری قوت سے موجودہ نظام پر حملہ کر کے اسے میدان عمل سے ہٹا کر اس کی جگہ پر قابض ہو جاتے ہیں۔

اشتراکیت پوری تاریخ انسانیت کی تحریک کا کام معاشیات کے حوالے کرتی ہے۔ اس کا عقیدہ ہے کہ انسانی زندگی کے مختلف شعبوں میں صرف معاشیات ہی ایک شعبہ ہے جسے اساسی اور بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ باقی شعبے ثانوی حیثیت رکھتے ہیں۔ انسان کے فلسفی مذہبی اخلاقی خیالات معاشی حالات کے تابع ہوتے ہیں جیسے جیسے وسائل پیداوار ترقی کرتے جائیں گے معاشی حالات میں فرق پیدا ہوگا اور اسی فرق کے ساتھ سارے تصورات ورجحانات بدل جائیں گے۔

اسلام اور اشتراکیت میں ایک بڑا فاصلہ یہ بھی ہے کہ اشتراکیت سارے تصورات و مفاہیم کو اقتصادیات کا تابع سمجھتی ہے اور اقتصادیات کو ایک غیر جامد سیال حقیقت تسلیم کرتی ہے جس کا مقصد یہ ہے کہ دنیا میں کوئی غیر متغیر اور ٹھوس حقیقت نہیں ہے نہ فلسفہ نہ مذہب نہ اخلاق، نہ ماوراطبقات، اور اسلام ایسے ٹھوس حقائق کا قائل ہے جن میں کوئی تغیر وتبدل ممکن نہیں ہے۔ اس نے آغاز کائنات سے پہلے ہی ایک غیر متغیر ہستی کا اقرار کر لیا ہے اور اسی پر اعتماد کر کے پورے نظام حیات کو مرتب کیا ہے اس کا عقیدہ ہے کہ دنیا کے سارے رجحانات معاشی حالات کے تابع نہیں ہیں بلکہ تاریخ میں متعدد عوامل واسباب ایسے بھی ہیں جن کی بنیاد پر خود معاشیات کی گاڑی چل رہی ہے۔ وہ فلسفی افکار اور دینی عقائد کو جملہ معاشی حالات سے مافوق تصور کرتا ہے وہ اس بات کو تسلیم کرنے پر راضی نہیں ہے کہ تاریخ کے کسی دور میں اجتماع ضدین ممکن ہو جائے وجود وعدم ایک نقطہ پر جمع ہو جائیں دو اور دو کا مجموعہ پانچ ہو جائے اور توحید شرک سے بدل جائے۔

معاشی دنیا کے بے شمار انقلابات ان ٹھوس حقائق میں کوئی تبدیلی پیدا کر سکے ہیں اور نہ آئندہ کر سکیں گے۔ یہ اشتراکیت کا ایک خیال خام ہے اور بس۔

کفالت وضمانت

معاشی میدان میں ایک بڑی دلچسپ بحث یہ بھی ہے کہ اس کائنات میں کس انسان کا کتنا حصہ ہے اور اس حصہ کی بنیاد کیا ہے۔ اشتراکیت کا خیال ہے کہ کائنات کا خام مادہ بالکل بے ارزش اور بے قدر و قیمت ہے۔ اس میں قیمت وقدر کا سلسلہ انسانی محنت سے شروع ہوتا ہے اس لئے جو انسان جتنی محنت کرے گا اور جس قدر قیمت پیدا کرے گا وہ اس کا مالک کہا جائے گا۔ کسی دوسرے کو اس کی پیدا کی ہوئی قیمت میں حصہ بانٹنے کا حق نہیں ہے۔ اس کی نظر میں طبقاتی نزاع کا سارا فلسفہ یہی ہے کہ کارخانے کا مالک مزدور سے زیادہ قیمت پیدا کراتا ہے اور اسے کم اجرت دے کر باقی قیمت پر خود قبضہ کر لیتا ہے اور اس طرح سماج کے اندر ایک مالک ومزدور کی جنگ شروع ہو جاتی ہے کبھی مالک مزدور پر فتح پاتے ہیں اور سرمایہ دار نظام وجود میں آتا ہے اور کبھی مزدور مالک پر غالب آتا ہے اور اشتراکی معاشرہ جنم لیتا ہے۔

ظاہر ہے کہ اس فلسفے کی بنا پر ان افراد کو زندہ رہنے کا کوئی حق نہیں ہے جو کام کرنے سے عاجز اور ملکی پیداوار میں کوئی اضافہ کرنے سے قاصر ہوں۔ ان کے لئے نہ کوئی ضمانت ہے اور نہ ذمہ داری۔ حکومت اپنے پاس سے کوئی انتظام اس لئے نہیں کر سکتی کہ اس نظام میں حکومت کی املاک کا کوئی تصور نہیں ہے، حکومت صرف عوام کے حقوق کی محافظ ہے اسے اپنی زندگی کی بقا سے زیادہ حصہ لینے کا کوئی حق نہیں ہے۔ وہ دوسرے کی کفالت کا بار کہاں سے اٹھا سکتی ہے۔

اسلام کا معاشی فلسفہ اس سے بالکل مختلف ہے وہ انسانی جد و جہد اور بشری محنت کو پوری اہمیت دینے کے باوجود خام مواد کی قدر و قیمت کا قائل ہے اور اس قیمت کو خالق کائنات کا ایک عطیہ تصور کرتا ہے۔ اس کا عقیدہ ہے کہ دنیا کی ہر پیداوار میں ایک حصہ اس مزدور کا ہے جس نے اپنی محنت سے قدر و قیمت کا اظہار کیا ہے اور ایک حصہ خام مادہ کا ہے جس نے محنت کو باوقعت بنایا ہے۔ ورنہ انسانی جد و جہد دریا سے پانی نکالنے سے زیادہ

اہمیت کی حامل نہ ہوتی۔ وہ اس خام مادہ کو مالک کا عطیہ قرار دیتے ہوئے اس کی ملکیت کا حق اس جائز شرعی حکومت کو دیتا ہے جسے خلافت الٰہیہ کا درجہ حاصل ہے اور جسے خالق کائنات نے اپنے فطری عطایا پر مکمل تصرف کا حق دیا ہے اس شرعی حکومت کی ذمہ داری ہے کہ قاصر و عاجز افراد کی زندگی کا انتظام کرے اور ساتھ ساتھ اپنے ذاتی املاک کے سہارے سماج کی معاشی سطح بھی بلند کرے۔ حکومت کی ذمہ داری صرف یہیں پر ختم نہیں ہوتی بلکہ سماج کے سارے افراد کو دو وقت کی روٹی اور سر چھپانے کی جگہ مل جائے بلکہ اس کی ایک بڑی ذمہ داری یہ بھی ہے کہ اپنی تنظیم خاص سے سماج کی معاشی سطح کو اونچی کرتی رہے اور عوام کو بہتر سے بہتر سامان حیات فراہم کرے۔

کفالت وضمانت کا نمایاں فرق یہ ہے کہ افراد کی زندگی کی ذمہ داری صرف حکومت کے سر نہیں ہے بلکہ اس کا محاسبہ ان عوام سے بھی کیا جائے گا جن کے پاس سامان زندگی موجود تھا اور ان کا ہمسایہ فاقہ کر رہا تھا لیکن سماجی سطح کی بلندی کی مسئولیت صرف حکومت کے سر ہے ولی امر کا فرض ہے کہ زکوٰۃ وصدقات کے مال سے فی سبیل اللہ رفاہ عام کا انتظام کرے اور معاشرہ کو اس منزل تک پہنچا دے جہاں غربا وفقرا تلاش وجستجو کے بعد بھی ہاتھ نہ آسکیں۔

> مولائے کائنات حضرت علی بن ابی طالب علیہ السلام نے تخت حکومت سنبھالنے کے بعد اسی حقیقت کا اعلان کیا تھا کہ ایک شخص کے فاقہ کرنے کا مطلب ہی یہ ہے کہ دوسرے نے اس کے حق کو غضب کر لیا ہے ورنہ کائنات خدا میں کسی کے رزق کی کمی نہیں ہے اور میں کسی بھی ظالم کو اس وقت تک عزت کی نگاہ سے نہیں دیکھ سکتا جب تک مظلوم کو اس کا حق نہ دلا دوں۔

فرمان علوی صاف آواز دے رہا تھا کہ حقیقی ولی اور عوامی کفالت اور توازن کا ذمہ دار اور سماجی سطح کی بلندی کا محافظ ومسئول ہوا کرتا ہے۔